Regd. L. No. 7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اکتوبر 1970

مودودی صاحب کا اعتراف

"کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں
جس پر مسلمانوں کے تمام فرقے متفق ہوں"

تفصیل اندر ملاحظہ فرمایئے:

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ - بی - گلبرگ - ۲ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک

سالانہ ــــ پاکستان ــــ دس روپے
سالانہ ــــ ہندوستان ــــ پندرہ روپے
سالانہ ــــ غیر ممالک ــــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاکستان ــــ ایک روپیہ

ہندوستان

ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

جلد (۲۳) | اکتوبر ۱۹۷۰ء | نمبر (۱۰)

فہرست

(۱) لمعات ــــــــ ۲
(۲) طلوعِ اسلام کنونشن ــــــــ ۶
(۳) نقد و نظر ــــــــ ۸
(۴) ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی ــــ (محترم پرویز صاحب) ۹
(۵) مودودی صاحب کی حالیہ تقریر ــــــــ ۳۵
(۶) اسلامی مملکت کا خواب ــ (جو کثرتِ تعبیر سے پریشاں ہو گیا) ــــ ۴۹
(۷) قرآنِ کریم کے خلاف سازش ــــــــ ۷۷

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت ۲۵/بی گلبرگ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس، ایبک روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

۱۱ ستمبر کی صبح، طلوع آفتاب سے بھی پہلے، زندہ دلانِ لاہور اپنے اپنے گھروں سے نکل کر ان سڑکوں پر ہو لئے جو ہاٹا پور، برکی، بڈیارہ کے محاذوں کی طرف جاتی ہیں ـــ بچے، بوڑھے، جوان، حتیٰ کہ عورتیں بھی ـــ کشاں کشاں، رواں دواں، جوق در جوق ـــ اکثر و بیشتر پیدل، کچھ سائیکلوں پر، بعض موٹر سائیکلوں پر، ایک خاص وضع قطع کے افراد ریڑھوں پر۔ دن زیادہ چڑھا تو سڑکوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ ہر ایک کا چہرہ شگفتہ و شاداب۔ سینہ میں جذبات کا بے پناہ تلاطم جو اپنے اظہار کے لئے بے ساختہ مختلف شکلیں اختیار کر رہا ہے۔ کوئی سیٹیاں بجاتا ہے، کوئی تالیاں پیٹتا ہے، کوئی ترانے گاتا ہے۔ اکثر منچلے بھنگڑا ڈالتے راستوں کو پیچھے چھوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ ایسا جوش و خروش، ایسا ولولہ و طنطنہ، نہ کبھی عید کی تقریب پر نظر آیا، نہ کسی عرس یا میلے پر۔ وہ جو غالب نے کہا تھا کہ ـــ

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

تو اس کاروانِ جذب و شوق کا ہر فرد اسی کا مظہر دکھائی دیتا ہے۔

یہ کاروانِ کیف و مستی کہاں جا رہا ہے؟ اور کیوں جا رہا ہے! اس سمت تو نہ کوئی قابلِ ذکر بستی ہے نہ آج کوئی خاص تقریب ہے۔ پھر اس قافلہ کی منزلِ مقصود کون سی ہے! اور وہاں کونسا مقناطیس ہے جس کی کشش انہیں بے اختیار اپنی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے۔

یہ کاروانِ عشق و مستی، پاکستان کی ان نئی زیارت گاہوں کی طرف رُخ کئے ہوئے ہے جن کی خاک کے ذرّے ان شہدا کے مقدس خون کے آئینہ دار ہیں جنہوں نے آج سے پانچ سال قبل اپنا آج ہمارے کل کے لئے قربان کر دیا تھا۔ یوں تو سارے ملک کو وہ محیر العقول داستانیں ابھی تک یاد ہیں لیکن اہل لاہور کے

تو دل کی دھڑکنیں ہنوز خاموش نہیں ہوئیں جو ستمبر ۱۹۶۵ء کے سترہ دنوں میں ان کے لئے موت اور زندگی کی کشمکش کی علامات بن رہی تھیں۔ یہ افرادِ کارواں اپنی نذرِ عقیدت پیش کرنے جا رہے ہیں ان مجاہدوں، غازیوں اور شہیدوں کی بارگاہ میں جن کی حب نبازانہ ہمت اور سرفروشانہ معرکوں کے صدقہ میں یہ آج زندہ بھی ہیں اور آبرومندانہ زندگی بسر کرنے کے قابل بھی ــــ اہلِ لاہور کا یہ جذبہ اور ذوق شوق دلیل ہے اس حقیقت کی کہ یہ لوگ احسان فراموش نہیں۔

یہ انبوہِ عظیم، کارواں درکارواں ان میدانوں میں پہنچ گیا جہاں آج سے پانچ سال پہلے، وہ معرکہ سرزد ہوا تھا جس نے دانشورانِ عالم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا، اور جو تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا ــــ لیکن وہاں ان کے لئے نہ کوئی انتظام تھا نہ اہتمام۔ لاہور میں یہ موسم ویسے ہی خاصا گرم ہوتا ہے اور امسال اس کی حدت اور شدت خاص طور پر بڑھی ہوئی تھی۔ ان میدانوں میں کوئی سایہ دار درخت بھی ایسے نہیں جو ان قافلوں کے لئے مسافرنواز بن سکیں۔ یہ "دیوانے" سارا دن، اسی شدت کی دھوپ میں ــــ اور شاید بھوکے پیاسے، ان گرد و غبار سے اَٹے ہوئے میدانوں میں رقصاں و جنباں، گھومتے پھرتے اور اپنے جذباتِ شوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتے رہے۔ اور اس کے بعد انہی جذبات کے زور پر، شام کو واپس آگئے ــــ واپسی پر بھی ان کے جوش اور ولولہ کا وہی عالم تھا۔

قوموں کے اس قسم کے جذبات بڑے قیمتی ہوتے ہیں اور انہی کی بنیادوں پر زندہ قومیں اپنے مستقبل کی عمارتیں استوار کرتی ہیں۔ لیکن کس قدر مقامِ تاسف ہے کہ ہمارے ہاں یہ جذبات، مضطرب موجوں کی طرح خود ہی ابھرتے ہیں اور اس کے بعد خود ہی خاموش ہو جاتے ہیں۔ کوئی اس سیلِ بے پناہ کو نظم و ضبط کے ساحلوں میں محصور کر کے، جوئے نغمہ خواں میں تبدیل کرنے کی فکر نہیں کرتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ انتظام حکومت کی طرف سے ہونا چاہیئے ــــ ایک منظم پروگرام کے ماتحت، اس روز، لاہور سے محاذات تک ٹرانسپورٹ کا انتظام ہو۔ ان میدانوں میں ان افراد کے بیٹھنے اور سستانے کے لئے سایہ اور فرش کا انتظام ہو۔ ابھی تک ہماری افواج میں، وہ افسر اور نوجوان موجود ہیں، جو اس جنگ میں، ان محاذوں پر لڑے تھے۔ وہ افسران پیکرانِ خلوص و محبت کو ساتھ لے کر، مختلف مقامات پر جائیں اور انہیں بتائیں کہ یہاں کیا ہوا تھا اور وہاں کیا۔ دشمن کی نفری کتنی تھی، ان کا سامانِ حرب و ضرب کس قدر حدود فراموش تھا۔ ان کے عزائم کیا تھے۔ انہوں نے ان محاذوں پر کس طرح حملہ کیا اور ہمارے جیوش و عساکر نے، تعداد کی اس قدر قلت اور سامانِ جنگ کی اس قدر کمی کے باوجود، انہیں کس طرح استخواں شکن شکستیں دیں۔ ظاہر ہے کہ جنگ کی داستانیں جو ان مجاہدین کی زبانی بیان ہوں گی جو خود ان معرکوں میں شریک تھے، جو اثر پیدا اور جو ولولے بیدار کر سکتی ہیں، ان کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

اس کے ساتھ ہی قوم کو یہ بھی بتایا جائے کہ اب دشمن کے عزائم کیا ہیں اور ان کے پیشِ نظر ہماری ذمہ داریاں کیا۔ بیشک اس "میلہ" میں شستہ کھیل تماشے بھی ہوں اور سنجیدہ تفریح کے سامان بھی۔ آلاتِ جنگ کے معائنے بھی ہوں اور فوجی نقل و حرکت کے مظاہرے بھی۔ اس طرح اس دن کو ایک زندہ اور پرکشش تقریب کی شکل دے کر، قوم کے ان حرارت آمیز جذبات کو صحیح مصرف میں لایا جائے اور یوں ہماری اس معرکہ آرا، فیصلہ کن جنگ کی داستانِ زریں، آئندہ نسلوں تک منتقل ہوتی چلی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی قوت کا راز جذبۂ جہاد میں مضمر تھا لیکن، ایک خاص سازش کے ماتحت، قوم کے دل سے جہاد کی اہمیت کو اس قدر کم اور رفتہ رفتہ محو کر دیا گیا کہ اب "خالد" اور "طارق" نام رکھنے کے علاوہ، قوم کو کچھ یاد ہی نہیں کہ جہاد نے کیا کچھ کیا تھا اور ہماری زندگی میں اس کا مقام کیا ہے۔ آپ کی ساری تاریخ قلم اور زبان کے معرکوں سے لبریز ہے لیکن تیغ و سناں کی چمک (صدرِ اوّل کے بعد) کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ حجرہ نشین زاہدوں، اور بادیہ پیما قلندروں کے محیرالعقول افسانے آپ کو ہر منبر و محراب سے سنائی دینگے لیکن سربکف مجاہدوں اور کفن بدوش غازیوں کی معرکہ آرائیوں کے تذکرے آپ کے لئے کہیں بھی فردوسِ گوش نہیں بنیں گے۔ خود حکومت کے محکمہ اوقاف کو دیکھئے۔ ان کی طرف سے کسی سائیں بوٹے شاہ کے عرس اور کسی حضرت سیت شاہ کے ختم کے لئے ہزاروں روپے وقف ہونگے لیکن حرام ہے جو سال بھر میں کسی مجاہد کی یاد میں یا کسی شہید کی تقریبِ شہادت کے سلسلہ میں ایک پائی بھی خرچ کی جائے۔ ان کی طرف سے کتابیں بھی شائع ہوں گی تو انہی کے کشف و کرامات سے مملوّ — تاکہ قوم مزاجِ خانقاہی میں پختہ سے پختہ تر ہوتی چلی جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر محکمۂ اوقاف، جنگِ ستمبر کے شہداء کی یاد میں، مذکورہ بالا تقریب کو اسکے شایانِ شان طریق سے منانے کے لئے ضروری رقم مخصوص کر دے تو ہو سکتا ہے کہ وہ، اس محکمہ کی "بخشش" کا ذریعہ بن جائے۔

معلوم نہیں "میلہ مویشیاں" (ہارس اینڈ کیٹل شو) کا ڈھول فوج کے گلے میں کیسے پڑ گیا — بھلا فوج کا میلہ مویشیاں سے کیا تعلق — لیکن بایں ہمہ، جس حسنِ تدبیر سے اور نظم و نسق سے وہ اس میلہ کا انعقاد کرتی ہے، وہ فوجی روایات کے مصداق ہیں۔ ہم ملک کے محکمۂ دفاع سے مشورۃً گزارش کرینگے، کہ وہ "میلہ مویشیاں" کے بجائے، جنگِ ستمبر کی تقریب منانے کا فریضہ اپنے ذمے لیں اور اسے ایک ہفتہ تک پھیلا دیں۔ اسی میں لاہور سٹیڈیم یا فوجی قورٹرس میں منعقد ہونے والی تقاریب بھی شامل ہوں اور جنگ کے محاذات پر منعقد کی جانے والی محافل بھی۔ آپ دیکھیں گے کہ اس سے ہماری ملی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا — ایک درخشندہ اور حیات بخش باب کا اضافہ۔

لیکن اگر ایسا نہ کیا گیا تو پھر رفتہ رفتہ عوام کے یہ جذبات افسردہ ہو جائینگے اور اس کے بعد ہمارے اس روح پرور معرکہ کی یاد بھی دلوں سے محو ہو جائے گی۔ اور اگر محاذوں پر جانے کا یہ سلسلہ کسی طرح جاری بھی رہا تو پھر یہ بھی اسی قسم کی رسم بن کر رہ جائے گی جس قسم کی رسمی تقاریب ہماری عیدیں بن چکی ہیں ـــــ ہم عیدالفطر کی تقریب مناتے تو اس ذوق و شوق اور طربِ مسرت سے ہیں لیکن کسی کو اس کا علم و احساس بھی ہوتا ہے کہ یہ تقریب کس واقعہ کی یاد میں منائی جاتی ہے ـــــ لوگوں کو نہ حق و باطل کا عظیم انقلابی معرکہ جنگِ بدر یاد ہے (جو سترہ رمضان کو واقعہ ہوا تھا) نہ نزولِ قرآنِ کریم کی انسانیت ساز تقریب کا کچھ علم ـــــ عیدالفطر انہی دو تقاریب کا حسین مجموعہ ہے جسے اب محض رسم کے طور پر منا لیا جاتا ہے ـــــ اگر جنگِ ستمبر کے سلسلہ میں محاذوں پر جانے کی روش باقی بھی رہی تو یہ محض ایک رسم بن کر رہ جائے گی۔ ضرورت ہے کہ اسے بے جان رسم بن کر رہ جانے سے بچایا جائے اور اس کی روح کو زندہ اور تابندہ رکھا جائے۔ ہمارے نزدیک یہ حکومتِ پاکستان کا اولین فریضہ ہے جس کی ادائیگی نہایت ضروری ہے۔ قومیں اپنی تاریخ کے اسی قسم کے اوراق کے صدقے زندہ رہا کرتی ہیں۔

اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ (ان رازہائے سربستہ کو چھوڑ کر جن کا افشا قرینِ مصلحت نہیں) جنگِ ستمبر کی ایک مصدقہ تاریخ مرتب اور شائع کی جائے ـــــ لیکن جو قوم اور جو حکومت "تحریکِ پاکستان" کی مستند تاریخ اور بانیٔ پاکستان کے باوثوق سوانح حیات مرتب نہیں کرپائی، اس سے یہ توقع کرنا کہ جنگِ ستمبر کی مستند تاریخ مرتب اور شائع کرے گی، اپنے آپ کو فریب میں مبتلا رکھنا ہے ـــــ لیکن اس فریبِ خوردگی کے سوا اور چارہ بھی کیا ہے! پاکستان کی محبت میں یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔

کسے معلوم تھا عشق اس طرح لاچار کرتا ہے
دل اس کو جانتا ہے بے وفا اور پیار کرتا ہے

(ب)

طلوعِ اسلام کی تیرہویں سالانہ کنونشن

امسال، طلوعِ اسلام کی سالانہ کنونشن، اپنے روایتی وقار و سنجیدگی اور سادگی و شادابی کیساتھ،

ادارہ طلوعِ اسلام، واقع بی/۲۵ - گلبرگ (۲)، لاہور میں

مؤرخہ ۲۳ - ۲۴ - ۲۵ اکتوبر، بروز جمعہ ہفتہ اتوار منعقد ہوگی

کنونشن کے کچھ اجلاس خصوصی ہونگے جن میں صرف بزمہائے طلوع کے ارکان و مدعوئین خصوصی شرکت کر سکینگے۔ باقی اجلاس کھلے ہونگے جن میں وہ دیگر حضرات بھی شامل ہو سکینگے جو پیش کردہ مقالات، خطابات، تقاریر کو سکون اور سنجیدگی سے سننا چاہیں۔

کھلے اجلاسوں کا مشروط پروگرام حسب ذیل ہوگا!

(۱) پہلا اجلاس ——— ۲۳ر اکتوبر۔ بروز جمعہ ——— بوقت ۔ ۲½ بجے دوپہر

خطاب پرویز صاحب ——— قدیم اور جدید کی کشمکش

(کیا قوانینِ شریعت میں تبدیلی ہو سکتی ہے؟)

(۲) دوسرا اجلاس ——— ۲۴ر اکتوبر۔ بروز ہفتہ ——— بوقت ۔ ۲½ بجے دوپہر

مجلسِ مذاکرہ ——— جس میں بالعموم طلبا و طالبات حصہ لینگے۔

عنوان ——— اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!

(۳) تیسرا اجلاس ——— ۲۴ر اکتوبر۔ بروز ہفتہ ——— بوقت ۔ ۸ بجے شب

مجلسِ استفسارات ——— پرویز صاحب، آپکے (موصول شدہ) سوالات کے جوابات، قرآن کریم کی روشنی میں دینگے۔ یہ مجلس بڑی بصیرت افروز اور حقیقت کشا ہوتی ہے۔

(۴) چوتھا اجلاس ——— ۲۵ر اکتوبر ——— بروز اتوار ——— صبح ۔ دس بجے

خطاب پرویز صاحب ——— قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے، ہنگاموں سے نہیں!

(ملک میں آندھیوں کے جو طوفان اٹھ رہے ہیں ان کا نہایت ٹھنڈے دل سے تجزیہ اور علم و بصیرت کی رو سے اس بحران کا علاج)

* جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، طلوعِ اسلام کے اجلاس کی حیثیت عام پبلک جلسوں جیسی نہیں ہوتی۔ یہ ایک طرح کی فکری محفلیں ہوتی ہیں جن میں نظم و ضبط اور آدابِ مجلس کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ مستورات کے لئے الگ پردہ کا انتظام ہوتا ہے۔

(ناظم اکرام طلوعِ اسلام)

قرآن مجید سمجھ میں نہیں آتا

اب آپ ایسا نہیں کہہ سکتے ـــــ کیوں؟ اسکا جواب غور سے سنیئے!

پرویز صاحب ہمارے دور کی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے اپنی ساری عمر قرآن مجید پر غور و فکر میں صرف کی ہے اور گزشتہ تیس سال سے اپنی فکر کے نتائج کو مسلسل قوم کے سامنے پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ ان کی دو درجن سے زائد نہایت بلند پایہ تصانیف اس حقیقت کی زندہ شہادت ہیں۔ آخر میں انہوں نے اپنی تمام فکری کاوشوں کو دو اہم تصانیف میں سمٹا دیا ہے جن سے قرآن کریم کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک آیت کا صحیح مفہوم نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ ان میں سے پہلی تصنیف ہے

لغات القرآن

جس میں قرآنی الفاظ کے صرف لغوی معانی نہیں دیئے گئے بلکہ ان کا واضح مفہوم، نہایت دلکش انداز میں سامنے لایا گیا ہے ـــ یہ گراں بہا علمی تصنیف، چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ جن کی مجموعی قیمت پچاس روپے ہے۔

اسکے ساتھ ہی انہوں نے، پورے قرآن مجید کا مفہوم (الحمد سے والناس تک مسلسل) اس انداز سے مرتب کیا ہے کہ آپ اسے ایک کتاب کی طرح پڑھتے جایئے، قرآنی مطالب نکھر کر سامنے آتے چلے جائینگے۔ اس کا نام ـــ

مفہوم القرآن

ہے۔ اس سے پہلے اس کے ستائیس پارے شائع ہوئے تھے۔ اب ہمیں امید ہے کہ کنونشن کے موقعہ پر ہم اس کا مکمل سیٹ (یعنی نہایت خوبصورت پائیدار جلدوں میں) پیش کر سکینگے۔ اس کے بعد کسی کو یہ شکایت نہیں رہے گی کہ قرآن مجید سمجھ میں نہیں آتا۔ وما علینا الا البلاغ

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

نقد و نظر

ماہنامہ حکایت (لاہور)

قارئین کو یاد ہوگا کہ ہم نے ایک دفعہ یہ دعا مانگی تھی کہ ـــ خدا بھائیوں کی اس جوڑی کو سلامت رکھے۔ یہ بھائی تھے، خورشید عالم اور عنایت اللہ ـــ اول الذکر ۱۹۶۵ء کا پاکستانی کہ اسلام کا درد اور پاکستان کی محبت جس کے خون کے ذرات میں حلول کر چکی ہے۔ اور ثانی الذکر وہ کہ جنگِ ستمبر کے شہداء سے عشق گویا اس کا جزوِ ایمان ہے۔ یہ دونوں سیارہ ڈائجسٹ میں تھے اور اسے اپنے خونِ جگر کی آبیاری سے "شجرِ طیب" بنائے چلے جا رہے تھے۔ لیکن سرمایہ داری کے تقاضے کچھ اور تھے، اس لئے ڈائجسٹ کے مالکوں کو ان کی یہ روش پسند نہ آئی اور انہیں بادلِ ناخواستہ اسے چھوڑنا پڑا۔ اپنے رفقائے کار کے ساتھ ان کے تعلقات کس نوعیت کے تھے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ان کے نکلنے کے ساتھ ہی عملہ کا بیشتر حصہ حتےٰ کہ خوش نویسوں تک' ان کے ساتھ ہی چلا آیا۔ اور اب انہوں نے اپنا ماہنامہ ـــ حکایت ـــ جاری کیا ہے جس کا پہلا شمارہ' جو جنگِ ستمبر نمبر ہے' ہمارے سامنے ہے۔ وہی آن بان۔ وہی حسن و زیبائی۔ مضامین کا وہی معیار' اس فرق کے ساتھ کہ پہلے یہ پابہ زنجیر تھے اس لئے ان کے قلم کی جولانگاہ' زنجیر کی لمبائی تک محدود تھی۔ اب یہ آزاد ہیں۔ سیارہ ڈائجسٹ نے جس انداز سے جنگِ ستمبر کے مجاہدوں اور شہیدوں کی یاد قائم کر رکھی تھی' اب وہی فریضہ پہلے سے بھی زیادہ جگر سوزی اور بیباکی کے ساتھ حکایت سرانجام دے گا۔ چنانچہ پہلے ہی شمارہ میں' چونڈہ کی ٹینکوں کی ہولناک جنگ، کھیم کرن کی اذان، بلوچ رجمنٹ، پاک فضائیہ کے شاہین، سیالکوٹ کے صحن میں ـــ جیسے حرارت افروز مضامین اس کی شہادت دیتے ہیں۔ یہ ماہنامہ ملک کے سنجیدہ طبقہ کی طرف سے ہر قسم کی حوصلہ افزائی کا مستحق ہے۔

قیمت۔ فی پرچہ ۲ روپے ، سالانہ خریداری۔ پندرہ روپے ۱۵/-

پتہ :- [illegible] ۔ شارع فاطمہ جناح۔ لاہور

(۔۔۔)

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

اتوار ۶ ستمبر کی شام، بزم طلوعِ اسلام لاہور کے زیرِ اہتمام، وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔ ہال میں شہدائے پاکستان کی یاد میں ایک روح پرور اجتماع منعقد ہوا جس سے پرویز صاحب نے برجستہ خطاب فرمایا۔ اسے از سرِ نو مرتب کر کے زینتِ اوراقِ طلوعِ اسلام کیا جاتا ہے!

صدرِ گرامی قدر، و عزیزانِ محترم۔ سلام و رحمت۔

آج صبح نماز کے وقت، ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو آواز آئی ـــــ پرویز صاحب! یومِ استقلالِ پاکستان مبارک ـــــ آواز اس قدر جذب و کیف میں ڈوبی ہوئی تھی کہ اسے سننے کے ساتھ ہی ـــــ اِک لرزشِ خفی میرے سارے بدن میں تھی ـــــ یہ آواز تھی جنگِ ستمبر کے اس مردِ مجاہد کی جس نے کھیم کرن، اور چونڈہ، دونوں محاذوں پر سرفروشانہ معرکے سر کئے تھے، اور جنگ کے بعد جن کی دعوت پر مجھے پاکستان کی نئی زیارت گاہوں[1] کی خاک بوسی کی سعادت نصیب ہوئی تھی ـــــ میں نے ان کا دلی شکریہ ادا کیا لیکن اس احساس سے بے حد ندامت ہوئی کہ اس ہدیۂ تبریک کی پہل میری طرف سے ہونی چاہیئے تھی کیونکہ اس کے حقیقی مستحق تو یہ مجاہد اور غازی تھے جن کی جاں فروشیوں کے تصدق، ہم آج زندگی سے ہمکنار ہیں ـــــ لیکن شہید اور غازی پر کون سبقت لے جا سکتا ہے۔ اس لئے اس باب میں بھی سبقت انہی کا حق تھا۔ حقیقت یہ ہے، برادرانِ عزیز کہ اگر ہمارا ملی احساس بیدار اور ہماری غیرت جوان ہوتی تو ہمیں آج کا دن جشنِ عید کی طرح منانا چاہیئے تھا جیسے

---

[1] جنگ کے مختلف محاذوں کے پرویز صاحب کے چشم دید حالات، "پاکستان کی نئی زیارت گاہیں" کے عنوان سے طلوعِ اسلام میں بالاقساط شائع ہوتے تھے۔

آپ عید (الفطر) کہتے ہیں، آپ کو معلوم ہے کہ وہ کس واقعہ کی یاد کا جشن ہے۔ روزے سب سے پہلے ۲ھ میں فرض ہوئے اور سترہ رمضان کو بدر کے میدان میں حق و باطل کی ابدی کشمکش کا وہ معرکہ پیش آیا جو انسانیت کی موت اور حیات کے لئے فیصلہ کن لمحہ تھا ــــ اور رمضان ہی میں نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی تھی۔ عید الفطر نزولِ قرآنِ کریم اور فتحِ بدر کا جشنِ عید تھا۔ یہی فیصلہ کن حیثیت ہماری ملی زندگی میں ستمبر ۱۹۶۵ء کے معرکہ کو حاصل ہے۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد سال میں دو دن ایسے آتے تھے جنہیں ہم حاصلِ مراد قرار دیتے تھے۔ ایک یومِ پاکستان جب قوم نے اپنے لئے ایک جداگانہ آزاد مملکت کے حصول کے عزمِ راسخ کا اعلان کیا۔ اور دوسرا یومِ آزادی جب ہمارا مقصود حاصل ہو گیا۔ لیکن اب ہماری حیاتِ اجتماعیہ میں یہ تیسرا دن ایسا ہے جو ان دونوں دنوں سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اس لئے زیادہ اہم ہے کہ ایک پیدائشی اندھے کی بینائی سے محرومی بھی کچھ کم وجہِ سوہانِ روح نہیں ہوتی لیکن جو شخص بینائی حاصل کرنے کے بعد کسی حادثہ سے، پھر سے نابینا ہو جائے، اس کی باقی زندگی کس قیامت خیز کربِ اضطراب سے گزرتی ہے، اس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ حصولِ آزادی سے پہلے ہم آزادی کی لذت سے ناآشنا تھے۔ اس لئے اس سے محرومی ہمارے لئے باعثِ دردِ سر تو ضرور تھی، وجہِ سوزِ جگر نہیں تھی۔ لیکن آزادی ملنے کے بعد اگر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے نتیجہ میں، خدانخواستہ، ہزار بار خدانخواستہ، ہم اپنی آزادی سے محروم ہو جاتے تو اس سے ہماری جو حالت ہو جاتی، اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ جو میرے نزدیک، وہ دن جب ہماری آزادی چھنتے چھنتے بچی، اور ہماری متاعِ حیات لٹتے لٹتے محفوظ رہی، ہماری تاریخ کا عظیم ترین دن ہے۔ اور وہ جنہوں نے اُس وقت اپنی جانیں دے کر ہماری زندگی کا سامان مہیا کر دیا، اس قابل کہ ــــ جب تک پاکستان زندہ و پائندہ ہے، خدا اسے ابدالآباد تک زندہ و پائندہ رکھے ــــ ملتِ پاکستانیہ کا ہر فرد، بصد خلوص و محبت، اور بہزار تسلیم و نیاز، ان کی بارگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرے۔

مرے خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد!

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۟ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔ (۲/۱۵۷)

(۰)

عزیزانِ من! آج جو دردمند حضرات قوم کی حالت پر غور کرتے ہیں، وہ سب کچھ کہہ سن لینے کے بعد، ایک لمبی ٹھنڈی سانس بھر کر، باصد حسرت و یاس، یہ کہہ کر بات ختم کر دیتے ہیں کہ صاحب! قوم کی جو جو خرابیاں گنائی گئی ہیں، وہ سب اس میں موجود ہیں۔ وہ جس تباہی کے گڑھے کی طرف کشاں کشاں اور رواں دواں چلی جا رہی ہیں، اس کا بھی ہمیں احساس ہے۔ اس زوال اور انحطاط کا

ہم میں کیڑے نہیں

جو انجام ہوا کرتا ہے وہ بھی ہماری چشمِ تصور کے سامنے ہے لیکن ہم ان خرابیوں کے اسباب و علل پر جوں جوں غور کرتے ہیں، ایک ہی نتیجہ پر پہنچتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم میں کیریکٹر نہیں رہا۔

جس نتیجہ پر یہ حضرات پہنچتے ہیں وہ بادن تولے چار رتی درست ہے۔ اس کے صحیح ہونے میں کسی کو ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔ قومیں ڈوبتی اُس وقت ہیں جب ان میں کیریکٹر نہیں رہتا۔ یہ سب بجا اور درست۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں؟ وہ کیا چیز ہے جس کا قوم میں فقدان ہے۔ کیریکٹر کا لفظ تو ایک اصطلاح ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک کسی اصطلاح کا مفہوم واضح نہ ہو تو بات سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔ آج ہمارے ہاں جس قدر ذہنی خلفشار اور عملی تشتت و انتشار پیدا ہو رہا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قوم کو یکے بعد دیگرے، نہایت خوشنما، نگاہ فریب سحر انگیز اصطلاحات دی جا رہی ہیں جن کا متعین مفہوم کبھی سامنے نہیں لایا جاتا۔ یہ مبہم اصطلاحات رفتہ رفتہ سلوگن کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور پھر بلند آہنگ نعرے بن کر فضا میں ارتعاش پیدا کئے چلی جاتی ہیں۔ عوام ان اصطلاحات سے مسحور ہو کر آنکھیں بند کئے، ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں اور نہ یہ کسی سے پوچھتے ہیں، نہ انہیں کوئی بتاتا ہے کہ ان الفاظ کے معانی کیا ہیں اور ان اصطلاحات کا مفہوم کیا۔ جن کی خاطر انہیں اس قدر قربانیاں دینے کے لئے آمادہ اور مشتعل کیا جاتا ہے ــــ "ہم اس لئے تباہ ہو گئے کہ ہم نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے"۔ "ہم جب تک اسلام کے پابند نہیں ہوتے، ہماری بگڑی بن نہیں سکتی"۔ "ہمیں کہیں سے کوئی نظریہ، کوئی مسلک، کوئی لائحہ عمل مستعار لینے کی ضرورت نہیں۔ اسلام ہماری، بلکہ پوری نوعِ انسانی کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے"۔ یہ اور اسی قسم کے دیگر سلوگن، ہم برسوں سے سنتے چلے آ رہے ہیں اور ان نعروں سے مسحور ہو کر معلوم عوام کس قدر قربانیاں دے چکے اور دے رہے ہیں۔ لیکن آج تک اتنا کسی نے نہیں بتایا کہ وہ اسلام ہے کیا جسے چھوڑنے سے ہمارا یہ حشر ہو گیا ہے، اور جسے اختیار کرنے سے ہمارا ہر کام سنور جائے گا۔ "اسلام" کی اصطلاح سے آگے بڑھے تو پھر "اسلامی نظام"۔ "اسلامی آئین"۔ "اقامتِ دین"۔ "نظامِ شریعت" جیسی اصطلاحات سامنے لائی گئیں اور عوام سے کہا گیا کہ ان کی تمام مشکلات کا حل اس نظام اور آئین کے اندر موجود ہے۔ عوام بیچارے ان دعاوی کو بھی اعلاناتِ مسیحا سمجھ کر ان کے پیچھے لگ گئے لیکن انہیں کسی نے اتنا بتانے کی زحمت گوارا نہ کی کہ ان اصطلاحات کا عملی مفہوم کیا ہے۔ پھر "بحالیٔ جمہوریت" کی اصطلاح کا غوغا بلند ہوا اور اس زور شور سے کہ اس نے صورِ اسرافیل کو بھی مات کر دیا۔ اصطلاح یہ بھی مبہم ہی رکھی گئی۔ آجکل فضا میں "اسلام کا معاشی نظام"۔ "اسلامی سوشلزم"۔ "مساواتِ محمدیؐ" جیسی اصطلاحات گونج رہی ہیں۔ اس میں بھی ہر مدعی کا دعویٰ یہ ہے کہ اصلی اور سکہ بند مال صرف اسی کے ہاں سے مل سکتا ہے۔ دوسروں کے ہاں جعل سازی ہے، نقالی ہے۔ فریب ہے، دغابازی ہے۔ لیکن کیفیت پھر وہی ہے کہ ان اصطلاحات کا مفہوم کوئی بھی واضح نہیں کرتا۔

محض سلوگن

اب ظاہر ہے کہ جس قوم کا معمولِ زندگی یہ ہو چکا ہو کہ اس میں اصطلاحات عام کی جائیں لیکن ان کا مفہوم کبھی واضح نہ کیا جائے، وہاں اگر یہ کہا جائے کہ ہماری تمام خرابیوں کا بنیادی سبب یہ ہے کہ قوم میں کیریکٹر نہیں رہا، لیکن اس کی وضاحت نہ کی جائے تو اس کا گلہ کس سے کیا جائے اور تقاضا کس سے؟ تقاضا کرنے پر بھی زیادہ سے زیادہ یہ کہا جائے گا کہ یہاں ہر شخص جھوٹ بولتا ہے، دوسرے کو دھوکا دیتا ہے، رشوت کے بغیر کوئی کام ہو ہی نہیں سکتا۔ ہر شخص جائز اور ناجائز ہر طریق سے زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا سبب اس کے سوا کیا ہے کہ قوم میں کیریکٹر نہیں رہا — یہ ٹھیک ہے کہ ان خرابیوں کا سبب یہی ہے کہ قوم میں کیریکٹر نہیں رہا لیکن سوال یہ ہے کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں جس کے نہ ہونے سے یہ خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں — آئیے، ہم آج کی نشست میں یہ دیکھیں کہ کیریکٹر کہتے کسے ہیں، کہ جب تک اس اصطلاح کا مفہوم واضح نہیں ہوگا، جن مردانِ حق آگاہ کی یاد منانے کے لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں، ان کی عظمتِ شان و رفعتِ مقام کے صحیح نقوش اجاگر نہیں ہو سکیں گے۔

(۰)

کیریکٹر کسے کہتے ہیں

کیریکٹر کی وضاحت میں عام طور پر ایک مثال سے کیا کرتا ہوں جسے دہرانے کی اجازت چاہتا ہوں۔ آپ کو سخت بھوک لگ رہی ہے۔ نقاہت سے آپکا بُرا حال ہو رہا ہے۔ آپ اپنے ایک دوست کے ہاں جاتے ہیں۔ وہ نہایت عمدہ پلاؤ کا گرم گرم قاب آپ کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ آپ لپک کر اس کی طرف بڑھتے ہیں۔ لقمہ اٹھاتے ہیں کہ اتنے میں باورچی اندر سے آکر کہتا ہے کہ صاحب! یوں تو اس پلاؤ میں ہر چیز نہایت اعلیٰ معیار کی ہے لیکن غلطی سے نمک کی جگہ اس میں سنکھیا پڑ گیا ہے — سوچئے کہ کیا اس کے بعد آپ وہ لقمہ منہ میں ڈال لینگے؟ آپ کبھی ایسا نہیں کرینگے۔ اتنی شدید بھوک کے باوجود آپ اسے باہر پھینک دیں گے — ڈر اور لالچ وہی محرکات ہوتے ہیں جن سے آپ کسی سے اس کی خلافِ منشاء کام کرا سکتے ہیں۔ اُس وقت اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ آپ اس پلاؤ کو کھائیے ورنہ آپ کو قید کرا دیا جائے گا تو آپ پھر بھی اسے نہیں کھائینگے۔ اور اگر کوئی شخص آپ کو پچاس ہزار روپیہ رشوت کے طور پر دے تو آپ اسے بھی ٹھکرا دینگے۔ زہر آلود پلاؤ کبھی نہیں کھائیں گے۔ اس سوال کے جواب کے لئے کہ آپ ایسا کیوں نہیں کرینگے، اس قدر شدت کی بھوک، قید و بند کے خوف اور اتنی بڑی رشوت کے لالچ کے باوجود، اُسے کیوں ٹھکرا دینگے، کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص اسے سمجھ سکتا ہے کہ اسکے کھانے سے چونکہ آپ کو جان کا خطرہ لاحق ہے اس لئے آپ بھوک برداشت کر لینگے لیکن اپنے آپ کو ہلاکت میں نہیں ڈالیں گے۔ بالفاظِ دیگر، جان کے خطرے کے مقابلہ میں آپ بھوک کی تکلیف کو ترجیح دینگے۔

اب اسی مثال کو آپ ذرا آگے بڑھایئے۔ جب آپ نے اس پلاؤ کا لقمہ اٹھایا تھا، اگر اس وقت آپ کا وہ دوست آپ سے یہ کہتا کہ بھائی! اس پلاؤ میں ہر شے بالکل خالص اور اعلیٰ درجہ کی ہے لیکن یہ ہے چوری کے مال کا۔۔۔ تو سوال یہ ہے کہ کیا آپ اس وقت بھی اس لقمہ کو باہر پھینک دینگے یا کھا جائینگے۔ بس اس سوال کے جواب سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ کیریکٹر کسے کہتے ہیں۔ اگر آپ اسے کھا جائینگے تو کہا جائے گا کہ آپ میں کوئی کیریکٹر نہیں۔ اور اگر آپ بھوک کی تکلیف برداشت کر لینگے لیکن اس ناجائز مال سے حاصل کردہ کھانے سے پرہیز کرینگے تو سمجھا جائے گا کہ آپ کا کیریکٹر بلند ہے۔ اور اگر آپ مہیب سے مہیب خوف اور بڑے سے بڑے لالچ کے باوجود اس کے کھانے سے اجتناب کرینگے تو کہا جائے گا کہ آپ کا کیریکٹر بہت بلند ہے۔

لیکن یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ اتنی سخت بھوک کے باوجود ایسے اچھے کھانے کو مسترد کیوں کرتے ہیں؟ آپ اسے کھا کیوں نہیں لیتے؟ اس میں سنکھیا تو پڑا نہیں جو آپ کو نقصان کا احتمال اور جان کا خوف ہو۔ وہ تو نہایت عمدہ کھانا ہے۔ چوری کا ہے تو ہوا کرے، اس سے کھانے کی نوعیت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ یہ بات سمجھنے کی ہے اور اسی کے سمجھنے سے یہ نکتہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں اور جو لوگ ایسے مقام پر کیریکٹر کا ثبوت دیتے ہیں وہ ایسا کیوں کرتے ہیں!

(۲)

ماہرینِ علم الحیات ہمیں بتاتے ہیں کہ زندگی اپنے مختلف ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی حیوانات کے پیکر میں نمودار ہوئی تو اس کی اگلی کڑی انسانی ہیئت تھی جسے قرآن نے احسن تقویم سے تعبیر کیا ہے اور جسے ہم سمجھنے کی خاطر، انسانی سطحِ زندگی کہہ کر پکارتے ہیں۔ انسان میں اگر ۹/۱۰ حصہ حیوانی زندگی ہے تو ۱/۱۰ حصہ انسانی زندگی کا بھی ہے، جو حیوانی زندگی سے یکسر متمیز اور ممتاز ہے۔ حیوانات ایک اندرونی تہیج (URGE) کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں جسے جبلّت (یا INSTINCTS) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان میں سب سے

حیوانی جبلّت کے تقاضے

بنیادی جذبہ تحفظِ خویش (SELF - PRESERVATION) کا ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہے کہ ہر ذی حیات، ہر قیمت پر اپنی جان کی حفاظت کرتا ہے۔ اس کے لئے اسے جس قدر ذرائع و اسباب کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے حاصل کرتا اور محفوظ رکھتا ہے۔ چیونٹی کی ننھی سی جان ہوتی ہے۔ اسکے راستے میں ایک ذرا سا تنکا رکھ دیجئے اور دیکھئے کہ وہ اس سے محفوظ رہنے کے لئے کس قدر تڑپتی اور تلملاتی ہے۔ اور وہ جو کہتے ہیں کہ بلّی کے پاؤں جلنے لگے تھے تو اس نے اپنے بچے کو پاؤں تلے لے لیا تھا، تو وہ بھی اسی جذبۂ تحفظِ خویش کی نمود تھی۔ زندگی نے تحفظِ خویش کا یہی جذبہ انسان کو بھی ودیعت کیا ہے۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ انسان زیادہ سے زیادہ حاصل کرتا اور زیادہ سے زیادہ سمیٹتا ہے، اس کا محرک یہی جذبہ ہے۔۔۔ یہی اسکے

نزدیک نفع اور نقصان ماپنے کا پیمانہ ہے۔ ہر وہ عمل جس سے اسے تحفظ حاصل ہو اس کے نزدیک نفع بخش ہوتا ہے اور جس سے اس کے تحفظ کو خطرہ لاحق ہو، نقصان رساں۔ وہ جو آپ نے زہر آلود پلاؤ نہیں کھایا تھا، تو اس کا محرک بھی یہی جذبۂ تحفظِ خویش تھا۔ اس میں نہ آپ کی کوئی کاریگری تھی نہ خصوصیت۔ ایسے مقام پر حیوان بھی یہی کرتا ہے۔ جس چیز سے اسے خطرہ لاحق ہوتا ہے وہ اس سے دور بھاگتا ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ چیل کے سائے سے مرغی کے چوزے کس طرح بھاگ کر مرغی کے پروں تلے دبک کر بیٹھ جاتے ہیں اور بلی کی میاؤں سے چوہیاں کس طرح بلوں میں گھس جاتی ہیں۔ لہٰذا، اگر کوئی شخص اپنی جان بچانے کے لئے بھوک کی تکلیف برداشت کر لیتا ہے تو اسے اس کا کیریکٹر نہیں کہا جا سکتا۔ اگر کیریکٹر کا یہی معیار ہو تو پھر جانوروں سے بڑھ کر بلند کیریکٹر کا حامل کون ہو سکتا ہے؟ اگر آپ اپنے نفع کی سوچتے ہیں اور نقصان سے بچتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جائے گا کہ آپ سمجھ سے کام لیتے ہیں — کیونکہ پاگل اُسے کہتے ہیں جو اپنے نفع نقصان کا خیال نہ رکھے — دنیا اس پر ہنستی ہے۔

لیکن اس سے آگے ایک اور مقام آتا ہے جو حیوان اور انسان کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتا ہے۔ ایک بیل کو بھوک لگے اور اس کے دائیں جانب اپنے مالک کا کھیت ہو اور بائیں جانب کسی اور کا، تو وہ دائیں اور بائیں میں امتیاز کئے بغیر جس کھیت سے جی چاہے چارہ چر لے گا — اور یہ چیز اس کے خلاف نہ قانونی جرم قرار پائے گی نہ اخلاقی عیب۔ لیکن ایک انسان اگر ایسے مقام پر، اپنے کھیت کے بجائے غیر کی کھیتی سے غلہ لے جائے تو کہا جائے گا کہ اس نے ایک ناجائز کام کیا — جائز اور ناجائز کی تمیز، انسانی سطحِ زندگی سے شروع ہوتی ہے

جائز اور ناجائز کی تمیز

حیوانی سطح پر اس کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ اس جائز و ناجائز کا تعین ایک تو انسانی معاشرہ کرتا ہے — بعض باتوں کو وہ قانوناً ناجائز قرار دیتا ہے اور بعض کو سوسائٹی کے نقطۂ نگاہ سے معیوب۔ لیکن معاشرہ کا یہ معیار، حالات اور مصالح کے مطابق بدلتا رہتا ہے — آج جو بات قانوناً ناجائز ہے، کل ہی جب اس قانون میں ترمیم کر دی جائے گی تو وہ جائز قرار پا جائے گی۔ آج جس روش کو سوسائٹی معیوب قرار دیتی ہے کل ہی وہ روش سوسائٹی کا معمول (فیشن) بن سکتی ہے — علاوہ ازیں، ہر ملک کا قانون الگ الگ اور ہر قوم کا معاشرہ جدا جدا ہوتا ہے۔ جو بات ایک کے ہاں معیوب، مذموم ہوتی ہے وہ دوسرے کے ہاں مستحسن و ممدوح بھی جاتی ہے۔ لہٰذا انسانی معاشرہ کا معیار، عالمگیر انسانیت کے لئے جائز اور ناجائز، محبوب اور مذموم کا معیار نہیں بن سکتا۔ یہ معیار خدا کی

اس کا معیار

طرف سے بذریعہ وحی عطا ہوتا ہے جو عالمگیر بھی ہے اور زمان و مکان کی حدود سے ماوراء، غیر متبدل اور ابدیت در کنار بھی۔ اس معیار کی رُو سے جو امور جائز اور مستحسن قرار

پاتے ہیں، انہیں اسلام کی زبان میں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے طبیعی تقاضوں کا تعلق، اس کی حیوانی سطحِ زندگی سے ہے اور مستقل اقدار کا تعلق اس کی انسانی سطحِ زندگی سے۔ جو نظریۂ حیات، جو تصورِ زندگی، جو مسلک و مشرب، انسان کی طبیعی زندگی ہی کو زندگی کی آخری کڑی اور اس کے طبیعی تقاضوں ہی کو منتہائے مقصود اور حاصلِ مراد سمجھتا ہے، قرآن اسے کفر سے تعبیر کرتا ہے، وہ

صرف حیوانی زندگی کفر ہے

کھلے الفاظ میں کہتا ہے کہ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یَتَمَتَّعُوۡنَ وَ یَاۡکُلُوۡنَ کَمَا تَاۡکُلُ الۡاَنۡعَامُ۔ (۴۷/۱۲) جو لوگ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں اور جسم کے طبیعی تقاضوں ہی کو منتہائے مقصود قرار دے لیتے ہیں، انہیں کافر کہا جاتا ہے۔ ان کے برعکس، جو لوگ زندگی کے طبیعی تقاضوں کے ساتھ ساتھ، مستقل اقدار کی صداقت پر بھی یقین رکھتے ہیں، انہیں مومن کہا جاتا ہے۔ جسم کے طبیعی تقاضے، یا بالفاظِ دیگر، حیوانی جبلت (INSTINCTS) تو ہر وقت انسان کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان سے کسی صورت میں مفر نہیں۔ اسی لئے ان کا پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ لیکن جب کبھی ایسا ہو کہ جسم کے کسی طبیعی تقاضا اور مستقل قدر میں تصادم ہو جائے یعنی ان میں (TIE) پڑ جائے تو اس وقت جو شخص طبیعی تقاضا کو پورا کرنے کے لئے مستقل قدر کو قربان کر دے، اس کے متعلق کہیں گے کہ اس میں کیریکٹر نہیں اور جو شخص مستقل قدر کے تحفظ کے لئے جسم کے تقاضے کو قربان کر دے وہ بلند کیریکٹر کا ثبوت دیتا ہے۔ "مال صدقۂ جان، اور جان صدقۂ آبرو" سمجھ بوجھ اور کیریکٹر کے مفہوم کی وضاحت کے لئے نہایت جامع محاورہ ہے۔

اب ہمارے سامنے، برادرانِ عزیز! کیریکٹر کی صحیح (DEFINITION) اور اس کا واضح مفہوم آگیا۔

کیریکٹر کا مفہوم

یعنی جب جسم کے کسی تقاضا، یعنی حیوانی جبلت اور مستقل قدر میں تصادم ہو، تو جبلی تقاضا کو قربان کر کے، مستقل قدر کو محفوظ رکھنے کا نام کیریکٹر ہے۔ جب آپ سے کہا گیا تھا کہ وہ پلاؤ ویسے تو خالص اور عمدہ ہے لیکن ہے چوری کا، تو اس وقت جسم کے ایک طبیعی تقاضے اور مستقل قدر میں ٹکراؤ ہو رہا تھا۔ بھوک کا تقاضا تھا کہ پلاؤ کھا لیا جائے لیکن مستقل قدر کا فرمان تھا کہ اسے چھوا تک نہ جائے۔ اگر آپ نے بھوک کے تقاضے کو ترجیح دے کر، اسے کھا لیا، تو آپ نے کیریکٹر کا ثبوت نہ دیا۔ اگر آپ نے بھوک کی تکلیف کو برداشت کر لیا لیکن مستقل قدر کو ہاتھ سے نہ چھوڑا، تو آپ نے عمدہ کردار کا مظاہرہ کیا۔ آپ دیکھتے ہیں کہ ایک معاملہ میں، ذرا سا جھوٹ بولنے سے، دس ہزار روپیہ بلا تکلف آپ کی جیب میں آ جاتا ہے، بایں ہمہ کہ کسی کو کانوں کان اس کی خبر تک نہیں ہو سکتی۔ اگر اس وقت آپ اتنے بڑے لالچ کو ٹھکرا دیتے ہیں، اور سچ پر قائم رہنے کی مستقل قدر کی حفاظت کرتے ہیں تو اسے کہیں گے آپ کا کیریکٹر ــــ بس یہ ہے کیریکٹر اور

عدم کیریکٹر میں فرق اور یہ ہے کفر اور اسلام میں خطِ امتیاز۔ جس قدر شدید وہ تقاضا ہوگا جس پر آپ مستقل اقدار کو ترجیح دیتے ہیں، اتنا ہی بلند آپکا کیریکٹر ہوگا اور اتنا ہی درخشندہ آپ کا حسنِ عمل۔

جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے جبلی تقاضوں (INSTINCTS) میں تحفظِ خویش یعنی جان کی حفاظت کا جذبہ شدید ترین ہے۔ خود قرآن کی رُو سے بھی انسانی جان کس قدر گراں بہا ہے، اس کا اندازہ سورۃ المائدہ کی اس آیت سے لگائیے جس میں اس نے کہا ہے کہ یاد رکھو۔ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۔ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ۔ (۵/۳۲) جس نے کسی ایک انسانی جان کو بھی ناحق تلف کر دیا تو یوں سمجھو گویا اس نے پوری کی پوری نوعِ انسانی کی زندگی ضائع کر دی۔ اور جس نے کسی ایک جان کو بھی بچا لیا یوں سمجھو گویا اس نے ساری نوعِ انسانی کو زندگی عطا کر دی۔ اسی لئے اس نے تاکیداً کہا ہے کہ ـــــ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۔ (۲/۱۹۵) اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالا کرو۔

لیکن معاملاتِ زندگی میں ایک مقام ایسا بھی آجاتا ہے جہاں ایک طرف جان جیسی متاعِ گراں بہا ہوتی ہے اور دوسری طرف حق کی حفاظت، جو بلند ترین مستقل قدر ہے۔ یہ مقام بڑی شدید کشمکش کا مقام اور

موت اور حیات کی کشمکش

یہ آزمائش بڑی صبر آزما اور ہمت طلب آزمائش ہوتی ہے۔ حیوانی جبلت کا شدید ترین تقاضا ـــ تحفظِ خویش ـــ پکار پکار کر کہہ رہا ہوتا ہے کہ تم نے ایک قدم آگے بڑھایا اور موت کے بھیانک غار میں جا گرے۔ دوسری طرف انسانی زندگی کی نشیدِ جان فزا یہ مژدۂ دلنواز و روح پرور سنا رہی ہوتی ہے کہ ایک قدم آگے بڑھاؤ اور حیاتِ فانی کے مادی قالب سے نکل کر حیاتِ جاوداں کی عروسِ جمال افروز سے ہمکنار ہو جاؤ۔ یہی وہ شدید ترین کشمکش ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۶۷/۲) موت اور حیات کو پیدا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ تم دیکھ سکو کہ تمہاری ذات میں اس قدر استحکام پیدا ہو چکا ہے کہ تم اس جہانِ رنگ و بو کی رعنائیوں اور دلکشیوں سے صرفِ نظر کر کے حیوانی زندگی کے اس شدید تقاضے کو جھٹک کر حیاتِ جاوید کے مستحق قرار پا جاؤ۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، تم اس حقیقت کا مشاہدہ کر لو کہ

خودی ہے زندہ تو ہے موت اِک مقامِ حیات
کہ عشق موت سے کرتا ہے امتحانِ ثبات

یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۔ (۸/۲۴) اے مومنین! تم خدا اور رسول کی اس دعوت پر لبیک کہو جو

تمہیں ایسی چیز کی طرف بلاتی ہے جس سے تمہیں حقیقی زندگی عطا ہو جائے گی۔ یعنی ایک تمہاری موجودہ زندگی ہے جو طبیعی قوانین کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اور جس نے ایک دن بالآخر ختم ہو جانا ہے۔ خدا اور رسول کی یہ دعوت تمہیں اس عارضی زندگی کے بجائے، وہ حقیقی زندگی عطا کر دیگی جو کبھی فنا نہیں ہو گی۔ تم اس سودے کے نفع نقصان پر غور کرو اور سوچو کہ یہ دعوت تمہیں کس قدر قلیل قیمت کے عوض کیسی متاعِ بے بہا دے رہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب تک زندگی اور مستقل اقدار میں ٹکراؤ نہیں ہوا تھا، یہ زندگی اس قابل تھی کہ اس کا پورا پورا تحفظ کیا جاتا۔ لیکن جب ان دونوں میں تصادم ہو جائے تو پھر طبیعی زندگی کے معیارِ نفع و نقصان سے بلند ہو کر، حقیقی زندگی کی منفعت بخشیوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ یہی مومن کا شعار ہے۔ یہی بلندیٔ کردار کا ثبوت ہے۔ یہی مفہوم ہے اس بلند حقیقت کا جسے اقبالؔ نے ان حسین الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

جو مردانِ حقیقت شناس عام حالات میں اپنی جان کی حفاظت کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں، لیکن جب مستقل اقدار کے تحفظ کا سوال سامنے آجائے تو اسی جان کو بطیبِ خاطر ہنسی خوشی جان آفریں کے سپرد کر دیتے ہیں، ان کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری سطح بین نگاہیں یہی فیصلہ دیں گی کہ وہ مر گئے کیونکہ ان کی سانس کی آمد و رفت کا سلسلہ بند ہو گیا۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ وہ درحقیقت مرتے نہیں۔ وہ زندگی کی نچلی سطح کی قیمت ادا کر کے اس سے بلند تر سطح کی زندگی حاصل کر لیتے ہیں۔ اس لئے وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۔ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۔ (۲/۱۵۴) جو لوگ اللہ کی راہ میں، یعنی مستقل اقدار خداوندی کی حفاظت کے لئے، قتل ہو جائے انہیں مردہ مت کہو۔ وہ مردہ نہیں، زندہ ہیں لیکن تمہارا شعور جو زندگی کو محض نفس شماری سمجھتا ہے، اس بلند سطح کی زندگی کا ادراک نہیں کر سکتا۔

حیاتِ جاوداں کے مستحق

میزانِ خداوندی میں اس سے زیادہ وزنی کوئی حسنِ عمل نہیں۔ ایسا وزنی کہ اگر کسی کو اس سے پہلے، کوئی نیک کام کرنے کا موقعہ نہ ملا ہو، تو یہ ایک گراں بہا عمل، اس کے لئے جنت کا ضامن بن جائے۔ کیا آپ نے اس خوش بخت و فیروز مند عمرو بن ثابتؓ کا واقعہ نہیں سنا جو اسلام نہیں لایا تھا۔ غزوۂ احد کے دن، جب حق و باطل کی جماعتیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھیں، اس کے دل میں صداقت نے جوش مارا۔ مسلمان ہوئے، تلوار ہاتھ میں لی، جانفروشانہ لڑے اور شہید ہو گئے۔ حضورؐ نے لاش کو دیکھ کر فرمایا کہ کس قدر خوش نصیب ہے یہ کہ جس نے کبھی ایک وقت کی نماز تک نہ پڑھی لیکن سیدھا جنت میں جا پہنچا۔

عشق کی اِک جست نے طے کر دیئے قصّے تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

اس کے برعکس، ایسے تصادم کے وقت، جو لوگ اپنی جان کی حفاظت کے خیال سے میدان چھوڑ کر بھاگ اٹھیں، انکے متعلق تقدیر کے قاضی کا فیصلہ کیا ہے، اسے سننے سے پہلے، ذرا چشمِ تصور میں لائیے اس منظر کو کہ بدر کے میدان میں حق و باطل کا سب سے پہلا معرکہ درپیش ہے۔ حق کی مدافعت کے لئے، خود حضور نبی اکرمؐ کی قیادت میں ان صحابہ کبارؓ کا لشکر صف آرا ہے جن کی شمعِ ایمانی ظلمت کدۂ عالم میں ہمارے لئے دلیلِ راہ اور مشعلِ ہدایت بنتی ہے۔ عین اس وقت جب کمانوں کے چلّے چڑھائے جا چکے تھے، یہ تنبیہہ خداوندی نازل ہوتی ہے کہ یاد رکھو! وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۔ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۔ (۸/۱۶)۔ آج کے دن جو شخص بھی دشمن سے منہ موڑ کر بھاگے گا ۔ بجز اسکے کہ ایسا کرنا کسی جنگی ضرورت کے لئے یا اپنی دوسری پارٹی سے ملنے کے لئے ہو ۔ تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ خدا کے غضب میں ماخوذ ہو جائے گا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا، اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ اس کی عمر بھر کی نیکیاں سب غارت ہو جائینگی۔ قرآن نے کہا کہ اس طرح میدانِ کارزار سے بھاگ کر تم مزید چند دنوں کے لئے سانس تو ضرور لے سکو گے لیکن اس ذلت کی زندگی میں جو جہنمی موت پوشیدہ ہے اس کا تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ۔ (۱۴/۱۷) اس میں ہر طرف سے موت اپنے خونی پنجے نکالے یلغار کرتی ہوئی آتی دکھائی دیتی ہے لیکن وہ مرتے بھی نہیں کہ اس عذاب سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔ اس ذلت کی مرگ آفریں زندگی اور اس عزت کی حیات آفریں موت میں جو فرق ہے اُسے اقبالؒ نے ان حقیقت کشا الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

کھول کے کیا بیاں کروں سرِّ مقام مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف، مرگِ حیاتِ بے شرف

مرگِ باشرف اور حیاتِ بے شرف کا یہی وہ نازک ترین دوراہا تھا جس پر ہم نے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح، اپنے آپ کو اچانک کھڑے پایا تھا ۔ اُف! کیسا تھا وہ نازک مرحلہ اور کس قدر فیصلہ کن تھا ہمارے سفرِ حیات میں وہ دوراہا ۔ بال سے باریک، اور تلوار سے تیز "پل صراط" کہ جس پر سے اگر ذرا سا بھی پاؤں پھسلے تو ساری کی ساری قوم تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم میں جا گرے۔ ہندو جیسا منتقم مزاج، روباہ صفت، تنگ نظر، اور انتہائی کمینہ دشمن اٹھارہ برس کی مسلسل تیاری کے

۶ ستمبر کا دوراہا

بعد پاکستان سے پانچ گنا زیادہ تعداد کے لشکر اور بے محابا سامانِ حرب و ضرب کے ساتھ، اعلانِ جنگ کئے بغیر بے پناہ سیلابِ بلا اور بلا دانگ آتش خاموش کی طرح، ایسے وقت میں ہماری سرحدوں پر آن کھڑا ہوا جب ہم سب اطمینان اور سکون کی نیند سو رہے تھے ــــ لیکن میں نے یہ غلط کہا ہے کہ ہم سب اطمینان کی نیند سو رہے تھے۔ ہم تو بے شک سو رہے تھے لیکن جنہیں جاگنے کی ضرورت تھی وہ جاگ رہے تھے۔ قرآن کریم نے جماعتِ مومنین طائفین کی جماعت کہا ہے۔ طائف کہتے ہیں اس چوکیدار کو جو گشت کر کے پہرہ دے تاکہ سونے والوں کی جان مال عزت، آبرو، ہر خطرہ سے محفوظ رہے۔ ہم سو رہے تھے اور ہمارے طائفین کا گروہ، جو مشتمل تھا افواجِ پاکستان کے جواں ہمت، جفاکش اور وفاکیش، فرائض شناس اور جاں سپار،

شب زندہ دارانِ ملت

جیالوں پر، جو جاگ کر پہرہ دے رہا تھا۔ یہ ۵ اور ۶ ستمبر کی درمیانی رات ہی کو نہیں جاگتا رہا تھا، یہ مسلسل اٹھارہ برس سے شب بیدار رہا تھا، یہ الگ بات تھی کہ ہم سونے والوں نے اسے کبھی جاگتے نہیں دیکھا تھا۔ یہ اس کی مسلسل اٹھارہ برس کی شب بیداری کی ریاضت کا نتیجہ تھا کہ اس کے بعد سترہ دن تک ایک لمحہ کے لئے بھی اس نے آنکھ نہیں جھپکی، اور یہ اُنہی بندگانِ مولا صفات کی لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ۔ (۲/۲۵۵)۔ (نہ اُسے اونگھ آتی ہے نہ نیند) کا صدقہ تھا کہ ہم پھر اطمینان کی نیند سو سکے۔ ان خود آگاہ و خدا مست شب زندہ داران کی بیداریوں کا کیا عالم تھا، اس کا اندازہ ہمارے ٹینک رجمنٹ کے اس دفعدار کی قلبی کیفیت سے لگائیے جسے اس کے رفقاء "حافظ جی" کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ وہ حافظ قرآن تھا ــــ حافظِ قرآن ہی نہیں بلکہ وہ میدانِ کارزار میں شمشیر بکف اپنے آپ کو حافظِ قرآن سمجھتا تھا اور بالکل بجا اور درست ایسا سمجھتا تھا۔ اس نے جنگ کے بعد وقائع نگار کو بتایا کہ سب سے پہلے جو ٹینک دشمن کے مقابلہ کو پہنچے وہ میرے ٹروپ کے تھے۔ میں اپنے ٹروپ کے ساتھ مسلسل پانچ روز تک اپنے ٹینک سے فائر کرتا رہا۔ ایک روز جب شاید تین دن اور تین راتیں کھڑے کھڑے فائر کرتے گزر چکی تھیں، میری آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ میرا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ ہزار کوشش کے باوجود

میں سو کیوں گیا

میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ میرے ساتھیوں نے مجھے تھام لیا اور گھبرا کر پوچھنے لگے کہ حافظ جی! کیا ہوا ہے؟ میں نے ان سے پوچھا کہ میں کتنی دیر سویا تھا؟ انہوں نے کہا کہ آپ سوئے کہاں تھے۔ یونہی ذرا سی اونگھ آئی ہوگی۔ اس کے بعد آپ نے اپنے سر کو جھٹکا سا دیا اور آپ ہوشیار ہو گئے۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میری آنکھ ایک آدھ سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگی تھی تو مجھے اطمینان ہوا اور میرا رعشہ تھمنے لگا۔ حافظ جی نے رعشہ کی اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ جب میری آنکھ کھلی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بہت دیر تک سویا رہا ہوں۔ اس احساس سے مجھ پر عجیب سا

خوف طاری ہو گیا۔ خیال آیا کہ کس قدر مقدس فریضہ کی ادائیگی میں میری آنکھ لگ گئی۔ اگر اس حالت میں میرا ٹینک ہٹ ہو جاتا تو میں حرام کی موت مرجاتا اور اگلے جہاں جب خدا مجھ سے پوچھتا کہ بدبخت بندے! جب کفار میرے قرآن اور مساجد کی سرزمین میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے تو اُس وقت تجھے نیند کیسے آگئی تو میں کیا جواب دیتا؟ الحمدللہ کہ میں اس بازپرسی سے بچ گیا۔ بس صاحب! اس کے بعد نہ بھوک محسوس ہوئی نہ نیند آئی۔ نہ یہ ہوش رہا کہ دشمن کی فوج کتنی زیادہ ہے۔ میں تھا اور خدا کی طرف سے اس پرسش کا خیال۔ اس کے بعد بھلا نیند کیسے آ سکتی تھی!

موت و حیات کی ایسی شدید کشمکش میں مستقل اقدار کے تحفظ کا احساس تھا جسے اس سادہ ذہن، پاکیزہ فطرت، وفادارِ خدا کی پرسش سے تعبیر کیا۔ یہی بلند کردار اور حسنِ سیرت کی بنیاد ہے۔ اُن سترہ دنوں میں ساری دنیا محوِ حیرت تھی کہ اتنی تھوڑی سی فوج نے، اس قدر کم اسلحہ اور سامان کے ساتھ، آتش فشاں پہاڑ کے اُس آگ کے دریا کا مقابلہ کس طرح سے کیا۔۔۔ اور صرف مقابلہ ہی نہیں کیا بلکہ اس قدر سخنواں شکن شکست دی کہ ہندو کی آنے والی نسلوں کی ہڈیوں میں وہ چوٹیں وراثتاً منتقل ہوتی چلی جائیں گی۔ اور اس کے بعد بھی اس پانچ سال میں ماہرینِ فنِ حرب حسابی قاعدے جوڑ جوڑ کر تھک گئے ہیں لیکن انہیں اس سوال کا اطمینان بخش جواب نہیں مل سکا، کہ ان مولوں نے اس قدر مہیب کرگسوں (گدھوں) کے پر کیسے نوچ ڈالے! اس سوال کا جواب حسابی قاعدوں سے نہیں مل سکتا۔ اس کا جواب، مستقل اقدار کی صداقت پر اس ایمانِ محکم سے ملے گا جس کی رُو سے کہا گیا تھا کہ تمہارے دس مجاہد دشمن کے سو پر اور بیس مجاہد اس کے دو سو پر بھاری ہونگے۔ یہی جواب تھا جو امریکی میگزین ٹائم کے نامہ نگار لوئیس کرار کو ہماری فوج کے ایک اوفیسر کمانڈنگ نے دیا تھا۔ لوئیس نے (۲۲ ستمبر ۱۹۶۵ء کو) لکھا تھا کہ میں نے اس افسر سے پوچھا کہ اس کا بالآخر راز کیا ہے کہ آپ اسقدر قلیل التعداد ہونے کے باوجود ہندوستانیوں کو یوں مغلوب کئے جا رہے ہیں۔ اس افسر نے آنکھ اٹھا کر میری طرف دیکھا، مسکرایا اور کہا کہ

لوئیس کرار کو جواب

> اگر حوصلہ، جرأت و شجاعت ایسی اجناس ہوتیں جو بازار سے خریدی جا سکتیں تو ہندوستانی انہیں امریکی امداد کے ساتھ حاصل کر لیتے۔ (یہ متاعِ گراں بہا بازار میں نہیں مل سکتی۔ یہ سپاہی کے جذبۂ ایمان میں پوشیدہ ہوتی ہے)۔

سچ ہے۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں

یہی وہ شاہین جگر اور جری القلب شیرانِ غاب ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا ۖ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِیْلُ (۳/۱۷۲)۔ یہ وہ ہیں کہ جب لوگوں نے ان سے کہا کہ دشمن نے تمہارے خلاف ایک عظیم لشکر جمع کر رکھا ہے اس لئے تمہیں ان سے ڈرنا چاہیئے تو اس سے ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو گیا اور انہوں نے نہایت سکون و اطمینان سے کہا کہ — خدا داریم چہ غم داریم — وہ ہمارے لئے کافی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

اس اعتماد کی کیفیت اور قلت و کثرت کے فریب تخیل کی حقیقت پوچھیے میجر شفقت بلوچ (ستارۂ جرأت)

میجر شفقت بلوچ

سے جو اُس فیصلہ کن شب کو ہر کیے برکی سیکٹر پر اپنی کمپنی کے صرف ایک سو جوانوں کے ساتھ متعین تھے۔ رات کے تین بجے انہوں نے ایک پورے بریگیڈ کو جو ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں سے مسلح تھا، پاکستان کی طرف بڑھتے ہوئے پایا۔ میجر شفقت نے فوراً محسوس کیا کہ ایک عظیم آزمائش کا تاریخی مرحلہ سامنے آ گیا ہے۔ آسمان کی آنکھ نے جرأت و بسالت کا ایسا محیر العقول کارنامہ بہت کم دیکھا ہو گا جب ایک سو مجاہد ایک پورے بریگیڈ (قریب تین ہزار کے لشکر مہیب) پر بجلی بن کر ٹوٹ پڑے۔ اور انہوں نے ان کے ٹینکوں، بکتر بند گاڑیوں اور بھارتی سورماؤں کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا۔ دشمن بار بار از سرِ نو منظم ہو کر پوری قوت سے حملہ آور ہوا لیکن میجر شفقت اور ان کے یہ جانباز آہنی دیوار کی طرح اس کے سامنے ڈٹے رہے۔ انہوں نے مسلسل نو گھنٹے تک آگ اور خون کے اس سیلاب کا مقابلہ کیا تا آنکہ دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ جانے پر مجبور ہو گیا۔

جنگِ ستمبر کے طارقِ اول میجر شفقت اور اس کے جانباز رفیقو! پاکستان کی سالمیت تمہیں جھک کر سلام کہتی ہے۔

کہا جائے گا کہ اپنے ملک کی حفاظت فوج کا فریضہ ہوتا ہے جس کے لئے عندالضرورت جان بھی دینی

محض فرائض کی ادائیگی نہیں

پڑتی ہے۔ اس لئے ہماری افواج نے جو کچھ کیا وہ ان کے فریضہ کی ادائیگی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملک کی حفاظت فوج کا فریضہ ہوتا ہے لیکن جان دینے کے فریضہ کی ادائیگی کے لئے بھی جس قدر بلند جذبہ کی ضرورت ہوتی ہے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے بالمقابل بھی ایک فوج تھی اور اپنے ملک کے عسکری عزائم کا بروئے کار لانا (خواہ وہ ہمارے یا دنیا کے نقطۂ نگاہ سے کیسے ہی مذموم کیوں نہ ہوں) اُن کا بھی فریضہ تھا۔ لیکن انہوں نے جس انداز سے اس فریضہ کو ادا کیا اس کا بھانڈا بیچ چوراہے کے پھوٹ گیا تھا۔ حالانکہ ان کے اربابِ حل و عقد نے اس پر اتنے دبیز پردے

ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ بھارت میں ایک ممتاز اینگلو انڈین ہیں ۔ مسٹر فرینک انتھونی ۔ بار ایٹ لاء

فرینک انتھونی کا انکشاف

بھارت پارلیمان کے رکن اور وہاں کی دفاعی کونسل کے ممبر انہوں نے جنگِ ستمبر ۱۹۶۵ء کے ریکارڈ کی بڑی دقتِ نظر سے چھان بین کی۔ ۲۹ اپریل ۱۹۶۶ء کا ذکر ہے کہ بھارت پارلیمان میں کوئی رپورٹ زیرِ نظر تھی جس کے ضمن میں وہاں کی وزارتِ دفاع نے حسبِ معمول اپنی افواج کے کارناموں کی فرضی داستانیں بڑھا چڑھا کر پیش کرنی شروع کیں۔ جب بحث میں کافی گرمی پیدا ہو گئی تو مسٹر انتھونی خاموشی سے اپنی نشست سے اٹھے، اور اپنی تحقیقات کے نتائج کو بھری بزم میں اس انداز سے کھول کر رکھ دیا کہ اربابِ حکومت کا رنگ زرد اور چہرے فق ہو گئے۔ انہوں نے کہا کہ۔

> لاہور کی دہلیز پر بھارتی فوج کے کم از کم دس ہزار سپاہی اور چار سو افسر ہلاک ہوئے۔ ہماری گیارہویں کور کو ۱۰ ستمبر کی شام کو لاہور کے جم خانہ میں جامِ شراب نوش کرنے کے لئے متعین کیا گیا تھا۔ اس کور کے گیارہ بریگیڈیر نااہل ثابت ہوئے اور نو پلٹنیں ناکارہ نکلیں؛ حتیٰ کہ چند ایک ڈویژن کمانڈر (میجر جنرل) بھی بزدل اور بھگوڑے ثابت ہوئے اور تماشہ یہ کہ ان جرنیلوں کو جو میدانِ جنگ سے پچیس میل پیچھے دبک کر بیٹھے تھے، مہاویر چکر کا بلند ترین اعزاز عطا کیا گیا۔

یہ تھا وہ انداز جس سے اُس فوج نے اپنے فرائض کی ادائیگی کی تھی۔ اس کے برعکس، اِدھر یہ عالم تھا کہ اگر کسی کی ڈیوٹی ایسی تھی جس میں جان کا خطرہ نہیں تھا اور اس کے سامنے اگر کوئی ایسا مقام آیا جس میں جان دے کر کسی مورچے کو بچایا جا سکتا تھا، اور وہاں کا ڈیوٹی بردار شہید ہو چکا تھا، تو یہ لپک کر اس آگ میں کود گیا اور ہنسی خوشی جان دے کر دوسروں کو خطرہ سے بچا لیا۔ میں عزیزانِ من! یہ کہہ رہا ہوں اور میری چشمِ تصور کے سامنے محاذ

میجر خادم حسین

کھیم کرن کا شہیدِ اوّل، میجر خادم حسین آ رہا ہے۔ ان کی ڈیوٹی اگلے مورچہ کو گولہ بارود کا سامان پہنچانا تھا۔ وہ اس فریضہ کی ادائیگی میں ایک طرف کو جا رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ پاکستان کے ایک اہم مورچہ کا توپچی شہید ہو چکا ہے اور دشمن کے ٹینک تیزی سے ان مورچوں کی طرف بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ میجر خادم حسین نے محسوس کیا کہ اگر دشمن کے ٹینک ان مورچوں تک پہنچ گئے تو اس سے ہمیں بہت بڑا خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ وہ رکا اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس مورچے میں کود پڑا اور توپ سنبھال لی۔ بھارتی ٹینک بہت قریب پہنچ گئے تھے کہ مورچے سے پہلا دھماکا ہوا اور پہلے ہی نشانے

سے دشمن کے ٹینک کے پرخچے اڑ گئے۔ دوسرے گولے نے دشمن کا دوسرا ٹینک تباہ کر دیا لیکن اتنے میں تیسرا ٹینک مورچہ پر چڑھ آیا اور میجر خادم حسین کو مع مورچہ کے کچل دیا۔ لیکن اتنے میں لڑائی کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔ پاکستان کے شہباز دشمن کے ٹینکوں پر جھپٹ پڑے تھے۔ میدان صاف ہوا تو پلاٹون کمانڈر حیات یہ معلوم کرنے کے لئے لپک کر آگے بڑھا کہ یہ معجزہ کس "فرشتے" نے سرانجام دیا تھا! لیکن ٹینک کے نیچے کچلی ہوئی لاش کو اس وقت کون شناخت کر سکتا تھا؟ بعد میں پتہ چلا کہ وہ فرشتہ، میجر خادم حسین تھا۔ خادم حسین اپنا سامان لئے محفوظ چلا جا رہا تھا۔ مورچہ کی توپ چلانا اس کے فرائض میں داخل نہیں تھا۔ اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ مورچہ میں جانا، اپنے آپ کو موت کے منہ میں دھکیلنا ہے۔ سوچئے کہ وہ کون سا جذبہ تھا جس نے ہمارے اس جانباز کو "بے خطر آتشِ نمرود میں کود جانے" پر آمادہ کر دیا؟

خادم حسین! سرزمین پاکستان نے تجھے جان دے کر سرفرازی کے قابل بنا دیا، اپنی
جبینِ نیاز سے تجھے احترام آمیز سلام کہتی ہے۔

اور اس سلام کے ساتھ ہی میری نگاہوں کے سامنے، فیلڈ ایمبولینس کور کا وہ کمپاؤنڈر آجاتا ہے جس کے خون کی رنگینی سمائے ملت کی افق تابی کا موجب بنی۔ ایمبولینس کور کے جوانوں کا کام لڑنا نہیں ہوتا، زخمیوں کی دیکھ بھال کرنا ہوتا ہے۔ جنگ کے دوران ایک دن کا ذکر ہے کہ بی۔ آر۔ بی کے کنارے گھمسان کا معرکہ تھا۔ نہر کے اُس پار ہمارے کچھ سپاہی رائفلیں سنبھالے، دشمن کی یلغار کو روک رہے تھے۔ نہر کے اِس کنارے، فیلڈ ایمبولینس کور کے ایک کمپاؤنڈر نے دیکھا کہ ہمارا ایک سپاہی شہید ہو گیا ہے اور اس طرح حملہ روکنے والی دیوار میں شگاف پڑ گیا ہے۔ وہ نوجوان اِدھر تھا۔ درمیان میں تند و تیز نہر تھی جسے دشمن کے سپاہی ہزار کوششوں کے باوجود سترہ دن تک عبور نہیں کر سکے تھے۔ ہم دیکھتے کیا ہیں کہ اس کمپاؤنڈر نے چھلانگ لگائی اور نہر کی موجوں سے ٹکراتا ہوا دوسرے کنارے پہنچ گیا۔ اپنے بازو پر لگے ہوئے ریڈ کراس کے نشان کو نوچ کر پھینک دیا اور دوسری ثانیہ میں اُس شہید سپاہی کی رائفل سنبھالے، اس بنیانِ مرصوص کے شگاف کو پُر کرنے کے لئے صف آرا ہو گیا۔ یہ وہ معرکہ تھا جس میں بھارتی فوج کے میجر جنرل نرنجن پرشاد کو اپنی جیپ چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا۔ معرکہ سر ہونے کے بعد جب پلٹن کے جانی نقصان کا جائزہ لیا گیا تو اس میں ایک نفری زیادہ تھی۔ یہ اضافہ ایمبولینس کور کے اسی جانباز نے کیا تھا جس نے اقبال کے اس تخیل کو حقیقت بنا کر دکھا دیا تھا کہ

ایک کمپاؤنڈر

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اس طرح جلتے بھنتے، دیکھتے بھالتے، خطرہ کی آگ میں کود کر جان دے دینا فرائض اور ضابطہ کی پابندی سے ماورا، جذبہ کی بنا پر ہی ممکن ہے۔

اس سے بھی آگے بڑھیے ــــ لیکن آگے بڑھنے سے پہلے میں یہ عرض کر دوں کہ یہ واقعات کچھ پہلی دفعہ آپ کے سامنے نہیں آ رہے۔ انہیں آپ اس سے پہلے بھی سن چکے ہیں۔ اداروں سے تو ایک طرف، خود میں نے بھی انہیں گزشتہ برسوں کی اسی تقریب میں کئی بار دہرایا ہے اور پھر یہ طلوعِ اسلام میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ انہیں بار بار دہرانے کی ضرورت ہے[1] تاکہ ہماری وہ نسلیں جنہوں نے اس فیصلہ کن معرکہ کو دیکھا نہیں، جان لیں اور پہچان لیں کہ وہ کون تھے جن کے متعلق، ڈاہگ سرحد کیطرف جاتے ہوئے راستے میں، شہداء کی یاد میں ایستادہ ایک سادہ سے مینار پر یہ تابندہ و درخشندہ الفاظ منقوش ہیں کہ

"ہم نے تمہارے کل کی حفاظت کے لئے اپنا آج
قربان کر دیا ہے۔"

ٹینک رجمنٹ کا ڈرائیور

ابھی میں ہماری ٹینک رجمنٹ کا ایک ڈرائیور بھی تھا جس کا ٹینک ہٹ ہو چکا تھا اور وہ زخموں سے چور، اس شکستہ ٹینک کے سائے میں بیہوش پڑا تھا۔ ادھر سے گزرتی ہوئی ایک پلٹن کے ایک نائک نے اسے دیکھا تو وہ اس کے قریب گیا۔ اس میں ہنوز سانس باقی تھا۔ فیلڈ ایمبولینس کہیں دور تھی۔ اس نے جلدی سے اپنے جھولے سے پٹی نکالی کہ اس کا خون پونچھے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ میں پانی ٹپکایا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا کہ تم کون ہو؟ اور یہاں کیسے بیٹھے ہو؟ نائک نے واقعہ بتایا تو اس نے ڈوبتی ہوئی آواز سے کہا کہ گرائیں! مجھے چھوڑ دو اور اپنی پلٹن کے ساتھ ایڈوانس کرو۔ وہ نائک کہتا ہے کہ اس نے اس کی بات اَن سنی کر دی اور اس کے زخموں پر پٹی باندھتا رہا۔ اس نے دوبارہ آنکھ کھولی۔ اور معلوم اس دفعہ اس میں اتنا جوش کہاں سے آگیا کہ گرجتی ہوئی آواز سے کہا کہ معلوم نہیں تم کس بے غیرت پلٹن کے نائک ہو۔ دشمن یلغار کر رہا ہے۔ تمہاری پلٹن آگے بڑھ رہی ہے اور تم عورتوں کی طرح میرے سرہانے بیٹھے مرہم پٹی کر رہے ہو۔ دوست۔ اٹھو۔ لپک کر آگے بڑھو۔ میرے بچانے کی فکر نہ کرو۔ پاکستان کو بچانے کی فکر کرو۔ وہ بچ گیا تو سب کچھ بچ جائے گا۔

نائک آگے بڑھ گیا۔ دشمن پسپا ہو گیا۔ واپسی پر دیکھا تو وہ زخمی شہید ہو چکا تھا۔ اس کی وردی خون میں لت پت تھی اور اس کی پیشانی پر ہنوز وہ شکنیں باقی تھیں جن سے اس نے نائک کو ڈانٹا تھا۔ یہ اسکے

---

[1] قرآنِ کریم نے حق و باطل کے تاریخی معرکوں کو اسی مقصد کے لئے بار بار دہرایا ہے۔

ملنے کی شکن نہیں تھیں، گراموفون ریکارڈ کی وہ لکیریں تھیں جن میں ان جانثاروں کی اُن محیر العقول کارناموں کی داستانیں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی تھیں جنہیں دیکھ کر آسمان کے فرشتے عش عش کرتے اور ان پر تبریک و تہنیت کے پھول برساتے تھے۔

مسجودِ ملائک و آدم

تخلیقِ آدم کی تمثیلی داستان میں جب ملائکہ نے خمیرِ آدم میں آگ کی چنگاریوں اور خون کے چھینٹوں کو مضمر دیکھ کر کہا تھا کہ بارِالٰہا! تُو اُسے خلیفہ فی الارض بنا رہا ہے۔ مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ (۲/۳۰) جو زمین میں خون ریزیاں اور فساد انگیزیاں کریگا۔ تو ارشادِ خداوندی نے انہیں یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ "ہم جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے" اولادِ آدم کے یہ وہ تحیر انگیز کارنامے ہیں جنہیں دیکھ کر ملائکہ پکار اُٹھتے ہیں کہ اے خدائے علیم و خبیر! ہمیں اپنے عجز کا اعتراف ہے کہ ہماری نگاہ آدم کی ان مضمر صلاحیتوں کو دیکھ نہیں سکتی تھی جن کی بنا پر یہ مسجودِ ملائک قرار پایا تھا۔ اُس وقت ہم نے تعمیلِ ارشاد میں سجدہ کیا تھا۔ آج ہم علیٰ وجہ البصیرت آدم کے حضور احتراماً سجدہ ریز ہیں۔

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

لیکن میں عظمتِ آدم کی اس آسمانی تفسیر میں کھو کر کہیں اس سرفروشی کی ایمان افروز داستان کو بھول نہ جاؤں جس نے اس خطۂ ارض پر اقدار کے تقابل سے اس راز کو افشا کر دیا کہ کس طرح بڑی قدر کی خاطر چھوٹی قدر کو قربان کر دیا جاتا ہے اور اس طرح نفع و نقصان کے نئے پیمانوں سے عالمِ انسانیت کو آگاہ کر دیا۔ یہ بیان ہماری ٹینک رجمنٹ کے ایک لانس نائک کا ہے۔ اس نے کہا کہ لڑائی کا تیسرا دن تھا اور معرکہ ایسا گھمسان کا کہ جنگِ دست بدست تک نوبت پہنچ چکی تھی۔ میرا ٹینک ہٹ ہو گیا تو میں نے ایک مشین گن سنبھال لی۔

اسے میں لے لونگا

لیکن دشمن اتنا قریب تھا کہ اس نے ہینڈ گرنیڈ پھینکنے شروع کر دیئے۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ ہماری فوج کا ایک سپاہی جسے میں قطعاً نہیں پہچانتا تھا، میرے قریب آ کر لیٹ گیا اور کہنے لگا کہ وقت بہت نازک ہے۔ دشمن کے ہینڈ گرنیڈ تمہارے قریب آ کر پھٹ رہے ہیں۔ تم اطمینان سے اپنا کام کرتے جاؤ۔ اگر کوئی ہینڈ گرنیڈ تمہارے قریب آ کر گرا تو اُسے میں لے لوں گا۔ نائک نے کہا کہ میں سمجھ گیا کہ اس نے جو کہا ہے کہ "گرنیڈ کو میں لے لوں گا" تو اس سے اس کا مطلب کیا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ تم پاگل ہو رہے ہو۔ تم اپنی جان بچاؤ۔ میری فکر نہ کرو۔ اس نے کہا کہ گرائیں! بات میری اور تمہاری حفاظت کی نہیں۔ میرے پاس صرف رائفل ہے اور تمہارے پاس مشین گن ہے۔ اس وقت زیادہ ضرورت مشین گن کی ہے۔ میں مارا گیا تو ایک رائفل خاموش ہو جائیگی۔

اور غم ہلاسے گئے تو ایک مشین گن بیکار ہو کر رہ جائے گی۔ اس لئے .....

وہ اتنا کہنے پایا تھا کہ ایک گرنیڈ میرے قریب آکر گرا۔ وہ سپاہی کوندے کی طرح لپکا اور دھڑام سے گرنیڈ کے اوپر جا گرا۔ اس کے گرتے ہی گرنیڈ پھٹا اور اس کے ساتھ ہی اس کی بوٹیاں فضا میں اُڑ گئیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ ادھر یہ ہوا اور اُدھر ہمارے سپاہیوں نے دشمن کا منہ پھیر دیا اور اس کے بعد کوئی گرنیڈ ان کی طرف سے نہ آیا۔

وہ تانگہ یہ واقعہ سنا رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ اس نے کہا کہ نہ مجھے اس جانثار کا نام معلوم ہے نہ پلٹن کا اتا پتہ ——— پردیسیوں کا نام اور مقام کیسے معلوم ہو سکتا ہے ——— اگر مجھے کم از کم اس کے گاؤں ہی کا پتہ چل جاتا تو میں اس خوش بخت کی "بھاگاں والی" (صاحبِ نصیب) ماں کے پاس جاتا۔ اس کے قدموں کی خاک چومتا اور ہزار ہزار مبارک باد کے ساتھ کہتا کہ ——— دھن باد ہیں ایسی مائیں جو اس قسم کے سپوت جنتی ہیں ——— یہی ہیں وہ سپوت جنہیں اپنے چشمِ تصور میں لاتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

——— (۰) ———

اس قسم کے واقعات، عزیزانِ گرامی قدر! اتنی کثرت سے ہیں کہ میں انہیں سناتا جاؤں تو رات ختم ہو جائے لیکن یہ داستانیں ختم نہ ہوں۔ قلتِ وقت کے پیشِ نظر مجھے شجاعت و بسالت کے ان حیرت انگیز واقعات سے ہٹ کر اس جوہرِ انسانیت کی بھی دو ایک مثالیں پیش کرنی ہیں جس کے بغیر اس قسم کی بے لوث قربانیاں ——— جن میں نہ ستائش کی تمنا ہوتی ہے نہ صلہ کی امید ——— ظہور میں آہی نہیں سکتیں۔ ہم تاریخ میں پڑھا کرتے تھے کہ ایک دفعہ جب محمود غزنوی کی فوج ' فاتح و منصور' وطن واپس گئی

بڑھیا کا بیٹا

ہے تو ایک بڑھیا فوجیوں کے پاس آئی اور ان سے اپنے جوان بیٹے کے متعلق پوچھا جو ان کے ساتھ فوج میں گیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ اس کا بیٹا میدانِ جنگ میں کام آگیا تھا۔ اس پر بڑھیا نے پوچھا کہ یہ کیسے ہوا تو انہوں نے ازرہِ تفنن کہا کہ وہ میدان سے بھاگ رہا تھا۔ پیچھے سے اس کے تیر لگا اور وہ مر گیا۔ اس پر بڑھیا نے پورے جزم و یقین کے ساتھ کہا کہ تم غلط کہتے ہو۔ وہ کبھی میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ نہیں سکتا۔ اس کے تیر پیٹھ میں نہیں، سینے میں لگا ہوگا۔ بات افسر تک پہنچی تو اس نے بڑھیا سے کہا کہ تم تو میدانِ جنگ میں ساتھ نہیں تھیں۔ تم اس قدر یقین اور اعتماد کے ساتھ کس طرح کہہ سکتی ہو کہ تیرا اس کی

پشت پر نہیں سینے پر لگا تھا۔ اس پر اس نے کہا کہ میں نے اسے دودھ کا ایک قطرہ اس کے حلق میں نہیں ٹپکایا جو رزقِ حلال سے پیدا نہ ہوا ہو۔ اس لئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایسا بچہ میدان سے پیٹھ دکھا کر بھاگ اُٹھے۔ چنانچہ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ بڑھیا ٹھیک کہتی تھی۔ اس کے بیٹے نے سینے پر زخم کھا کر ہی جان دی تھی۔

رزقِ حلال وحرام

آج جب کہ ہمارے ہاں رزقِ حلال کے صرف الفاظ باقی رہ گئے ہیں، ہماری نئی نسلوں کے نوجوان شاید یہ دیکھ سکیں کہ رزقِ حلال سے کس قدر پاکیزہ جوہروں کی نمود ہوتی ہے اور رزقِ حرام کس طرح انسانیت ساز صلاحیتوں کو بھسم کر کے رکھ دیتا ہے ـــــ جو بچے بناسپتی کے اس قدر خوگر ہو چکے ہوں کہ خالص گھی سے ان کے حلق میں خراش ہونے لگ جائے، انہیں کیسے سمجھایا جا سکتا ہے کہ خالص گھی کس قسم کی توانائیاں پیدا کیا کرتا ہے ـــــ اور جس معاشرہ میں "خالص اور نخالص" تک کی بھی تمیز اُٹھ گئی ہو اس میں حلال اور حرام کا امتیاز کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ ان حالات میں ہم رزقِ حلال و حرام کے نتائج کی بحث میں تو نہیں جا سکتا، البتہ اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جن گھرانوں میں ہنوز مستقل اقدار کا چرچا ہوتا رہتا ہے، ان میں تربیت پانے والے بچوں کے تحت الشعور میں ان اقدار کی اہمیت ضرور جاگزیں ہوتی ہے اور جب شدت کا سفر درپیش ہو تو وہ ابھر کر سامنے آجاتی ہے اور اس سے ایسی حسین وجمیل صفات کی نمود ہوتی ہے جو فضا کی تاریکیوں میں سپیدۂ سحر بن کر چمک اٹھتی ہیں۔ ایسی ہی مجسم فردوس وعطر بیز بے ساختہ ادائے دل فروز کا مظاہرہ برکی کے محاذ پر میجر عزیز بھٹی سے ہوا۔ جس کا راوی ان کا کوارٹر ماسٹر اکرام ہے۔ اس نے بتایا کہ جب راجہ صاحب تین دن اور تین راتوں تک مسلسل کھڑے دشمن کا مقابلہ کرتے رہے، تو جب میں نے دیکھا کہ جو روٹی میں ان کے تھیلے میں ڈال آتا ہوں، وہ اسی طرح بڑی سوکھی رہتی ہے، اس میں سے میجر

میجر عزیز بھٹی

صاحب نے ایک لقمہ بھی نہیں توڑا ہوتا، اس پر مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میجر صاحب کو میٹھی پوریاں بہت پسند تھیں۔ میں نے نہایت لذیذ پوریاں تیار کرائیں اور انہیں لے کر میجر صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ وہ پوریاں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کھڑے کھڑے ایک پوری اٹھائی۔ اس میں سے ایک لقمہ توڑا، اور ساتھ ہی پوچھا کہ کیا سارے جوانوں کو اسی قسم کی پوریاں دی گئی ہیں۔ میں نے کہا کہ آج تو ان کے لئے اس کا انتظام نہیں ہو سکا، کل ایسا کر دیا جائے گا۔ یہ سنکر میجر بھٹی نے وہ پوری ہاتھ سے رکھ دی اور کہا کہ پھر میں بھی کل ہی پوریاں کھاؤں گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میجر پوریاں کھائے اور اس کے جوان سوکھی روٹی پر گزارہ کریں۔

یہ سنکر مجھے عزیزانِ گرامی قدر! چودہ سو سال پہلے کی اپنی تاریخ کا وہ واقعہ یاد آگیا کہ جب حضرت ابو عبیدہؓ فاتح کی حیثیت سے عراق پہنچے تو وہاں کے سرداروں نے آپ کی دعوت کی جس میں انواع واقسام کے کھانے

دسترخوانوں پر چنے گئے۔ آپ نے ان کھانوں کو دیکھا اور پوچھا کہ کیا یہ کھانے بالخصوص ان کے لئے تیار کئے گئے ہیں یا ساری فوج کو بھی کچھ دیا گیا ہے۔ جب جواب نفی میں ملا تو آپ نے یہ کہہ کر کھانا کھانے سے انکار کر دیا کہ ہمارے ہاں سپاہی اور سپہ سالار میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ میں اس وقت تک ان کھانوں کو ہاتھ نہیں لگاؤنگا جب تک میری ساری فوج ان میں شریک نہیں ہوگی۔

محاذِ چونڈہ کا معرکہ

اور یہی تھا ہماری اس قدر عظیم القدر محیر العقول کامیابی کا وہ راز جس کا انکشاف مجھ پر، چونڈہ کے محاذ پر ایک کرنل نے کیا۔ وہ ہمیں میدانِ جنگ کے سب سے اگلے مورچے دکھا رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ان مورچوں میں سپاہی تھے یا افسر بھی۔ انہوں نے کہا کہ جنگ کا عام نقشہ یہی ہوتا ہے کہ سب سے آگے سپاہی ہوتے ہیں اور ان کے بعد جوں جوں افسروں کا رینک (RANK) بڑھتا جاتا ہے، ان کا مقام پیچھے ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جرنیل سب سے پیچھے بیٹھ کر ہدایات نافذ کرتا ہے لیکن ہم نے جنگ کی بساط الٹ دی تھی: ہمارے جرنیل، بریگیڈیئر، کرنیل وغیرہ سب سپاہیوں کے ساتھ اگلے مورچوں میں تھے۔ اس طرح محمود و ایاز کے عملاً ایک صف میں کھڑے ہو جانے کا جو نتیجہ نکلا اس نے جنگ کے تمام حسابی قاعدوں کو الٹا کر رکھ دیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ علاوہ دیگر امور، یہ سوچئے کہ اگر کوئی افسر میدانِ جنگ میں مارا جائے تو سپاہی اس کی لاش لینے کے لئے اپنی جانیں تک دے دیتے ہیں۔ تو جو سپاہی افسر کی لاش کے لئے جان دے دیں وہ اپنے اس افسر کی زندگی کے لئے، جو اُن کے ساتھ مورچے میں کھڑا ہے کیا کچھ نہیں کر گزرینگے۔ چنانچہ ہمارے ان جوانوں نے وہ کچھ کر دکھایا جس پر ہم خود حیران تھے۔

میں نے کرنیل صاحب سے کہا کہ آپ نے اس جنگ میں جو بساط الٹی ہے تو یہ سنتِ رسول اللہ کے اتباع میں تھا۔ کیونکہ نبی اکرمؐ میدانِ جنگ میں خود مجاہدین کی پوزیشن کا تعین فرماتے تھے۔ اور قلبِ لشکر میں سب کے ساتھ خود شریکِ کارزار ہوتے تھے۔ میں یہ کہہ رہا تھا اور کرنیل صاحب اور ان کے ساتھیوں کی آنکھیں نم آلود ہو رہی تھیں۔ یہ آنسو اس مسرت کے تھے کہ انہیں اسوۂ رسول اللہ کے اتباع کی بھی سعادت نصیب ہو گئی۔

پاکیزگیٔ سیرت

اور اس سے بھی بڑھ کر، ہمارے مجاہدین کی پاکیزگیٔ سیرت کی وہ عدیم المثال نمود تھی جس کا اعتراف دشمن کو بھری مجلس میں کرنا پڑا۔ یہ مقولہ تو آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے (EVERY THING IS FAIR IN LOVE AND WAR)، اور اس جواز کے بعد فاتح فوج کے سپاہی جو کچھ مفتوحہ علاقہ میں جا کر کرتے ہیں، اس کے تصور سے حیا کی آنکھیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ جنگِ ستمبر میں ہماری افواج کے سپاہی فاتحانہ حیثیت سے دشمن

کے علاقوں میں داخل ہوئے۔ وہاں کی آبادی میں عورتیں بھی تھیں، لیکن انہوں نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا، اس کا جواب ہم سے نہیں، بھارت کے وزیر دفاع جگجیون کی زبان سے سنیئے۔ اس نے بھارت کی پارلیمان میں، ایک سوال کے جواب میں کہا تھا کہ

> اس سترہ روزہ جنگ میں کوئی ایسا واقعہ ہمارے نوٹس میں نہیں آیا جس میں پاکستانی فوج کے کسی فرد نے ہماری کسی عورت کو میلی نظروں سے بھی دیکھا ہو۔

اور ہماری افواج کے ان پاک باز و پاک بین مجاہدین کا یہ طرز عمل کس قوم کی عورتوں کے ساتھ تھا؟ اس قوم کی مستورات کے ساتھ، جس کے سپاہیوں کا اسی جنگ میں ہماری بہو بیٹیوں کے ساتھ جو سلوک تھا، اس کے لئے میں صرف ایک واقعہ پر اکتفا کروں گا جس کے راوی کرنل سیال ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ۱۷ ستمبر کی شام میں کیمپ میں بیٹھا تھا کہ ایک بوڑھا سا آدمی اور اس کے ساتھ ایک بڑھیا میرے پاس آئے جیسے کسی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے ہوں۔ اس بوڑھے نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ ہی اس رجمنٹ کے کمانڈر ہیں۔ جب میں نے ہاں کہا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ بڑھیا بے ساختہ میرے پاؤں پر گر پڑی۔ میرے بوٹوں کی مٹی اپنے ہاتھوں پر ملی اور اسے اپنے سر آنکھوں سے لگایا۔ مجھ پر تو یوں سمجھو جیسے بجلی گر پڑی ہو۔ میں نے اسے جھٹ سے اٹھایا اور کہا کہ تم تو میری ماں ہو۔ تم نے یہ کیا کیا؟ اس کے ساتھی بوڑھے نے کہا کہ یہ آپ کو میں بتاتا ہوں کہ اس نے کیا کیا ہے۔

ہڈیارہ کی بڑھیا

واقعہ یہ ہے کہ جب ۷ ستمبر کی صبح دشمن نے ہمارے گاؤں ہڈیارہ کو خالی کرایا ہے تو وہ گاؤں کی آبادی کو ہانک کر باہر لے گئے۔ انہوں نے ہم مردوں کے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے، بوڑھی عورتوں کو ایک طرف کھڑا کر کے کہہ دیا کہ انہیں گولی سے اڑا دیا جائے اور جوان عورتوں اور لڑکیوں کو الگ کر کے حکم دیا کہ انہیں سرحد کے پار لے جا کر سپاہیوں میں بانٹ دیا جائے۔ ہم میں سے ایک آدمی نے ان سے کہا کہ یہ تمہاری انتہائی کمینگی ہے۔ ہم مردوں کے ہاتھ کھول دو تو ہمیں کم از کم اس کی تو تسکین ہو جائے کہ ہم نے اپنی عزت و ناموس کی حفاظت کی خاطر جان دے دی۔ اس پر دشمن کے ایک سپاہی نے بندوق کا کندہ مار کر اس کا جبڑا توڑ دیا۔ وہ درندے ہماری معصوم بچیوں اور باعصمت عورتوں کی طرف لپکے۔ اس وقت ہماری بے کسی کا یہ عالم تھا کہ زمین کانپ رہی تھی، آسمان تھرا رہا تھا، وہ بچیاں بے ساختہ سجدوں میں گر گئیں اور درد و غم میں ڈوبی ہوئی آواز سے کچھ اس طرح خدا سے فریاد کی کہ ہمیں محسوس ہوا گویا

خدا کا عرش کانپ اٹھا ہے کہ اتنے میں اِدھر سے ایک گولہ آیا اور اس نے دشمن کی فوج میں کھلبلی مچا دی۔ میدان خالی ہو گیا تو عورتوں نے ہمارے ہاتھ کھولے اور ہم انہیں لے کر بحفاظت نہر کے پار پہنچ گئے۔ یہ بڑھیا جسے یوں سمجھو کہ اُن سب کی نمائندہ ہے، دو دن سے اُس "فرشتے" کو ڈھونڈھ رہی تھی جس نے ایسے وقت میں انہیں بچایا تھا۔ اس کے بعد جو ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔

عزیزانِ من! میں سمجھتا ہوں کہ بڈیارہ کا یہ واقعہ جنگِ ستمبر کا پورا پورا نقشہ ہمارے سامنے لا کر رکھ دیتا ہے۔ اگر ہمارے ان جسور و غیور مجاہدین کے گولے بروقت آتش بار نہ ہوتے تو پورا پاکستان بڈیارہ بن جاتا۔ اُف! کس قدر ہوشربا ہے اس کا تصور!!

> جنگِ ستمبر کے شہیدو اور غازیو! تم نے اپنے خون سے ملّتِ پاکستانیہ کی بیٹیوں اور بہنوں کی عصمت کی حفاظت کی۔ ان باعصمت بیٹیوں اور بہنوں کی پاکیزہ ردائیں تمہیں سلام کہتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے عزیزانِ من! کہ جس طرح جان کی حفاظت حیوانی جبلّت کا شدید ترین تقاضا ہے

حفاظتِ عصمت

اسی طرح حفاظتِ عصمت، انسانی زندگی کی گراں ترین مستقل قدر ہے۔ مومن کے سامنے جب عصمت کی حفاظت کا سوال آتا ہے تو اُس وقت دنیا کی بڑی سے بڑی قربانی بھی اس کے نزدیک ہیچ ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ "عصمت کی حفاظت" سے مراد اپنی عورتوں کی عصمت ہی نہیں۔ مومن کے نزدیک دنیا کی ہر عورت کی عصمت یکساں واجب الاحترام ہے۔ اس لئے اس کی حفاظت مومن کا فریضہ ہوتا ہے۔ جنگِ ستمبر میں ہمارے سرفروشوں نے جو اس قدر محیر العقول کارنامے کر دکھائے تو ان کا ایک بڑا محرک جذبۂ عصمت کی حفاظت بھی تھا۔ چنانچہ جب بلوچ رجمنٹ کے لانس نائک غلام مرتضےٰ سے ہسپتال میں پوچھا گیا کہ تم لوگ باٹا پور کی سرحد پر کھڑے لڑ رہے تھے، ملٹری (STRATEGY) کا تقاضا تھا کہ تم ذرا پیچھے ہٹ کر لڑتے۔ تم پیچھے کیوں نہ ہٹے۔ تو اس کے جواب میں اُس اَن پڑھ سپاہی نے کہا تھا کہ ہم پیچھے کہاں ہٹتے۔ پیچھے تو لاہور تھا اور لاہور میں ہماری مائیں، بہنیں، بیٹیاں ہماری عزتیں اور آبروئیں لے کر بیٹھی تھیں۔ سرحد پر کھڑے ہو کر ان کی حفاظت کرتے یا ملٹری سٹریٹیجی کو دیکھتے۔ وہ وقت آگے بڑھنے یا کھڑے رہ کر جان دینے کا تھا، پیچھے ہٹنے کا نہیں۔

یہی تھا حفاظتِ عصمت کا وہ مقدس جذبہ جسے میدانِ جنگ میں شہید ہونے والے ایک سپاہی نے جس کے ہاتھوں میں تازہ مہندی رچی ہوئی تھی، اپنی زندگی کے آخری سانسوں میں ان الفاظ میں بیان کیا کہ۔

میں چھٹی پر گھر گیا ہوا تھا۔ میری شادی میں تین دن باقی تھے کہ جنگ کا اعلان ہو گیا۔ اور مجھے فوری طور پر واپس آنا پڑا۔ میں گھر سے چلنے لگا تو میری والدہ اور ہمشیرہ نے اپنی خوشی پوری کرنے کے لئے میرے ہاتھ میں مہندی لگائی۔ میری منگیتر جو ہمارے اپنے ہی گھر کی لڑکی تھی، لجائی، شرمائی، گھونگھٹ نکالے، آگے بڑھی اور اپنی انگلی کا ایک قطرۂ خون میری مہندی میں ٹپکا کر خاموش واپس چلی گئی۔ میں گھر سے روانہ ہوا تو پیچھے سے آواز آئی کہ میدان میں جانا تو پیچھے کا خیال نہ کرنا، ایسے وقت زندگی میں بہت کم آیا کرتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ آواز میری ماں کی تھی، بہن کی یا منگیتر کی تھی۔ لیکن اس نے میری رگوں میں بجلیاں دوڑا دیں۔ جنگ کے ہر محاذ پر وہ آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی تاآنکہ اللہ نے مجھے شہادت کا درجہ دے دیا۔ یہ میرے گاؤں کا پتہ ہے۔ اگر ہو سکے تو میری منگیتر تک میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ میں نے تمہارے قطرۂ خون کی لاج رکھ لی ہے۔

ہاتھوں کی مہندی

اور کھیم کرن کے محاذ کے اس واقعہ کو کون بھلا سکیگا جسے میں کتنی بار بیان کر چکا ہوں اور کتنی بار دہراؤں گا۔ فوج کے سپاہی ایک گاؤں کے قریب سے گزرے تو گاؤں کی عورتیں باہر نکل آئیں۔ جمعدار کا بیان ہے کہ بوڑھی عورتوں نے ہمیں دعائیں دیں، پاس ہی چند ایک جوان لڑکیاں بھی کھڑی تھیں۔ معلوم ان کے جی میں کیا آئی کہ انہوں نے اپنی چُنیاں (دوپٹے) اتار کر سپاہیوں کی طرف پھینکیں اور کہا کہ "بھراؤ! بھیناں دیاں اینہاں چُنیاں دی لاج رکھنا"۔ جمعدار نے کہا کہ میرے سپاہیوں نے ان دوپٹوں کو امانت کے طور پر اپنے پاس رکھا اور ہم جس جگہ بھی جنگ میں گئے اس امانت کی حفاظت ہمارے لئے جزوِ ایمان بن گئی۔ میری پلٹن کے تین سپاہی نہایت بے جگری سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے ان دوپٹوں کو اپنی فولادی ٹوپیوں کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔

بہنوں کے دوپٹے

اور یہی تھے بہنوں کے وہ جاں نثار بھائی، جن کی یاد میں، ان بہنوں نے، اُن الفاظ کے ساتھ خاموش آنسو بہائے تھے، جنہیں میجر عزیز بھٹی کی شہادت کے بعد ان کی غمزدہ بہن نے، شہید بھائی کے نام اپنے خط میں یوں لکھا تھا کہ

شہید عزیز کی بہن کا خط

میرے راجہ بھائی! میں گھر سے بہت دور تھی کہ تمہاری شہادت کی خبر سنی۔ وطن پر قربان ہونے والوں میں تمہارا نام آیا تو جانتے ہو تمہاری بہن پر کیا گزری؟ تم سوچتے ہوگے کہ میں نے تمہاری یاد میں سسکیاں بھری ہوں گی۔ نہیں بھیّا! میں نے ایسا تو ہرگز نہیں کیا۔ میں نے تمہاری تصویر

اٹھائی۔ اسے آنکھوں سے لگایا۔ اور پھر آپ ہی بے ساختہ میرے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے۔

تو نے بہن کی لاج رکھ لی۔ بھیا تو کتنا بہادر نکلا۔

اور ہاں بھیا! میں روئی بھی تھی۔ رونا اس لئے نہیں آیا تھا کہ میں اپنے راجہ ویر کو اب کبھی نہیں دیکھ سکوں گی۔ بلکہ آنکھیں اس لئے بھر آئیں کہ کاش میں تمہارے قریب ہوتی اور شہید بھائی کی پیشانی چوم سکتی۔

لوگ کہتے ہوں گے میں پاگل ہو گئی ہوں جو تم سے باتیں کر رہی ہوں لیکن تم تو زندہ ہو اور ابد تک زندہ رہو گے۔ شہید کبھی نہیں مرتے۔ اچھا بھیا! خدا حافظ! اپنی بہن کی دعائیں قبول کرو۔

(تمہاری بہن۔ زیب رانی۔ کراچی)

شہیدوں کی یاد میں ان الفاظ سے زیادہ دل گداز اور مؤثر الفاظ، نہ کسی بڑے سے بڑے سحر نگار ادیب کے قلم سے نکل سکتے ہیں، نہ کسی شعلہ نوا خطیب کی زبان سے۔ اس لئے میں بھی اس ـــ حسین وسادہ ورنگین داستان کو انہی الفاظ پر ختم کرتا ہوں۔

ایک سوال

لیکن اس داستان کو ختم کرنے سے پہلے میں ایک سوال پہلے اپنے آپ سے پھر آپ احباب اور آپ کی وساطت سے پوری ملت پاکستانیہ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ہمارے ان شہداء کے گراں بہا خون کی یہی قیمت ہے جسے ہم آج اپنے معاشرہ میں اس طرح ادا کر رہے ہیں! ہمیں پاکستان جیسی عظیم مملکت ایک قطرہ خون بہائے بغیر مل گئی تھی ـــ یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہم نے پاکستان حاصل کرنے کے لئے لاکھوں جانوں کی قربانی دی تھی، تو یہ دعوےٰ حقیقت کے خلاف ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے جو کچھ ہمارے مہاجرین کے لٹتے قافلوں کے ساتھ کیا تھا، پاکستان اس سے پہلے حاصل کیا جا چکا تھا۔ اور وہ حاصل کیا جا چکا تھا ایک قطرۂ خون بہائے بغیر ـــ یہی وجہ تھی کہ ہم نے اس کی قدر نہ کی۔ بلکہ علامہ اقبالؒ نے تو اس سے بہت پہلے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

پہلے اٹھارہ اسی طرح گزر گئے۔ ہمارے اللّوں تللّوں کا نتیجہ یہ تھا کہ ۱۹۶۵ء میں یہ مملکت خداداد ہاتھوں سے نکلے جا رہی تھی کہ ہمارے جاں باز مجاہدوں نے، اپنے خون کی بے بہا قیمت ادا کر کے، اُسے از سرِ نو خرید

کر نہیں دے دیا لیکن اس پانچ برس کی مدت میں، ہم نے 'ثباتِ ملت کے بخیے ادھیڑ لے کے لئے' وہ کچھ کیا جو پہلے اٹھارہ برس میں بھی نہیں کیا تھا۔ اس وقت کم از کم مملکت کی وحدت قائم تھی اور ایک مضبوط مرکز موجود تھا جس کی وجہ سے دشمن کی یلغار کو روکنے کے لئے ہماری فوج اور اس کے پیچھے قوم ایک آہنی دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن اب اربابِ ملت کے 'خیر سے' عزائم یہ ہیں کہ مملکت کے حصے بخرے کر کے اسے پانچ چھ مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے اور مرکز کا وجود محض تبرکاً باقی رہ جائے۔ سوال یہ ہے کہ دشمن نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر جب پھر سے یلغار کی تو اس وقت کونسی دیوار اس کے راستے میں کھڑی ہو گی؟ یاد رکھیے! اس مملکت کی سالمیت اور حفاظت کا طریق وحدتِ پاکستان کے سوا کوئی نہیں۔ اگر ایسا کر لیا گیا تو یہ مملکت محفوظ رہ سکے گی ورنہ ——— ہماری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں ——— لیکن ہماری داستان کچھ ہی بنے، ان شہیدوں کی داستان کو زمانے کا کوئی حادثہ نہیں مٹا سکتا جنہوں نے اپنے خون کی قیمت سے حیاتِ جاوداں خریدی ہے۔ ان کی داستان 'قرطاسِ زمانہ' پر سورج کی سنہری کرنوں سے منقوش ہے۔

یہ مردِ مسلمان تھے وہ مردِ مسلمان جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے

اس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیم و خلیل

جنگِ ستمبر کے زمانے میں اگر اقبالؒ زندہ ہوتا تو وہ دیکھتا کہ اس نے اپنے "شاہین بچوں" کے ساتھ جو توقعات وابستہ کر رکھی تھیں، انہوں نے انہیں کس حسن و رعنائی اور شانِ زیبائی سے پورا کر دکھایا اور اس کی حقیقتِ منتظر کو کس طرح لباسِ مجاز پہنا دیا ——— وہ مردِ دانا و بینا اپنے خوابوں کی اس تعبیر کو دیکھتا اور پھر یہ بتاتا کہ ان شہداء نے اپنے خون کی رنگینیوں سے ہمارے لئے کس قدر سامانِ سرخروئی فراہم کر دیا ہے۔ جو حضرات اس زمانے میں موجود تھے انہیں یاد ہو گا کہ ۱۹۱۱ء میں جنگِ طرابلس نے مسلمانانِ عالم کے کاشانوں پر کس طرح بجلیاں گرا دی تھیں۔ ان شہداء کی یاد میں شاہی مسجد (لاہور) میں ایک تاریخی اجتماع ہوا تھا، حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنی وہ سنہری نظم پڑھی تھی جو بانگِ درا میں شامل ہے۔ اس میں انہوں نے یہ منظر پیش کیا تھا کہ وہ عالمِ بالا میں گئے تو فرشتے انہیں بارگاہِ رسالتمآبؐ میں لے گئے۔ حضورؐ نے پوچھا کہ تم خاکدانِ ارضی سے آئے ہو تو ہمارے لئے کیا تحفہ لائے ہو۔ اس پر اقبالؒ نے عرض کیا کہ ؎

حضور! دہر میں آسودگی نہیں ملتی

تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں — وفا کی جس میں ہو بُو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اِک آبگینہ لایا ہوں — جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تری اُمّت کی آبرو اس میں

طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

ہماری سوختہ ساماں، ستم رسیدہ قوم کے پاس کوئی ایسی مایہ ناز شے نہ تھی جسے ہم حضور رسالتمآبؐ میں بطور نذرانہ پیش کر سکتے۔ شہدائے پاکستان کا ہم پر یہ احسان کس قدر گراں بہا ہے کہ انہوں نے اپنے مقدس خون کا وہ آبگینہ ہمیں عطا کر دیا جسے ہم دنیائے انسانیت کے سامنے بصد فخر و مباہات اور اس کے بعد بارگاہِ نبی محترمؐ میں بہزار عجز و نیاز، آبرومندانہ طور پر پیش کر سکتے ہیں۔

اُمّت کی آبرو کی حفاظت کے لئے اپنی جانیں دے دینے والے جنگِ ستمبر کے شہیدو! ہمارے سرِ فلک پر چمکنے والے ستارو! ہمارا یہ ہدیۂ محقر قبول کرو کہ ہمارے پاس اس سے زیادہ تابندہ کوئی متاع ایسی نہیں، جو تمہارے شایانِ شان ہو۔ والسّلام!

(ج)

پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں

ہر اتوار - بوقت - صبح ۹ بجے

بمقام - ۲۵/بی - گلبرگ نمبر ۲ - لاہور

کراچی میں

ہر اتوار - بوقت ۹½ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)

بمقام - سیمینار ہال - سندھ اسمبلی بلڈنگ - سیکنڈ فلور

لائلپور میں

(بذریعہ ٹیپ)

ہر جمعہ - بوقت ۴½ بجے شام

بمقام - دفتر بزمِ طلوعِ اسلام - راجہ چوک ریل بازار

ملتان میں

(بذریعہ ٹیپ)

ہر جمعہ - بوقت بعد از نمازِ مغرب

بمقام شاہ محمد اینڈ سنز - بیرون پاک گیٹ ملتان

(فون - ۲۰۷۱)

مودودی صاحب کی حالیہ تقریر

زباں کچھ اور لیتے پیرہن کچھ اور کہتی ہے!

وہ جو کہتے ہیں کہ انسان کو اپنا ایک جھوٹ چھپانے کے لئے دس جھوٹ بولنے پڑتے ہیں' اس کی زندہ شہادت وہ کرب و اضطراب ہے جس میں (بیچارے) مودودی صاحب آجکل بُری طرح مبتلا ہیں اور جس سے نکلنے کا کوئی راستہ انہیں سُجھائی نہیں دیتا۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان کے دوران' اس تحریک کی سخت مخالفت کی اور بانیانِ تحریک —— قائداعظمؒ اور ان کے رفقاء کے خلاف جی بھر کر کیچڑ اُچھالا۔ لیکن تشکیلِ پاکستان کے بعد جب وہ ہندوستان سے بھاگ کر یہاں آگئے تو ایک عجیب مخمصے میں گرفتار ہوگئے۔ انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ ملک اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہو۔ اور چونکہ ہم ہی بتا سکتے ہیں کہ اسلامی نظام کیا ہوتا ہے' اس لئے ملک کی زمامِ اقتدار ہمارے حوالے کر دو۔ اس پر ان کے خلاف یہ اعتراض کیا گیا کہ آپ لوگ کل تک تو یہ کہتے تھے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی کافرانہ حکومت قائم ہوگی' اور آج آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ ملک اسلامی نظام کے قیام کے لئے حاصل کیا گیا ہے۔ اس تضاد بیانی کے کیا معنی! اگر مودودی صاحب میں اخلاقی جرأت ہوتی تو وہ اس کا اعتراف کر لیتے کہ مجھ سے ایسا سمجھنے اور کہنے میں غلطی ہوگئی تھی جس کے لئے میں نادم ہوں۔ لیکن اپنی غلطی کا اعتراف ان کی فطرت میں نہیں —— جو شخص بھی احساسِ کمتری کا شکار ہو' وہ اپنی غلطی کا اعتراف کبھی نہیں کیا کرتا۔ "عزت الاثم" (FALSE. PRESTIGE) کی انانیت اسے اس طرف آنے ہی نہیں دیتی —— انہوں نے ایسا تو نہ کیا اور غلط بیانیوں سے کام لینا شروع کر دیا۔

طلوعِ اسلام کی طرف سے نقاب دری

طلوعِ اسلام نے مودودی صاحب کے عزائم کو اسی زمانہ میں بھانپ لیا تھا جب انہوں نے قائداعظمؒ اور تحریکِ پاکستان کی مخالفت شروع کی تھی۔ چنانچہ اس کی طرف سے اسی زمانے (۱۹۴۰ء) میں ان کی مخالفت شروع

ہوگئی تھی۔ جب انہوں نے یہاں پہنچکر غلط بیانیوں کی روش اختیار کی تو طلوع اسلام نے ان کے کذب و افتراء کی نقاب دری شروع کی۔ چنانچہ اس تئیس سال کے عرصہ میں اس موضوع پر طلوع اسلام میں اتنا کچھ شائع ہوا ہے کہ اب کسی کو اس مقصد کے لئے کسی مزید تلاش و تحقیق کی بہت کم ضرورت پڑیگی۔ لیکن اس تمام عرصہ میں جماعت اسلامی کی مخالفت میں طلوع اسلام قریب قریب تنہا تھا۔ اس کے وسائل نہایت محدود تھے اور دوسری طرف جماعت اسلامی کے پاس زر وسیم کا بحرِ بیکراں تھا جس کے زور پر وہ طلوع اسلام کی آواز کو برابر دبائے چلی جارہی تھی ___ اور چونکہ ان کے نزدیک زندگی کے اہم تقاضوں کے لئے جھوٹ بولنا نہ صرف جائز بلکہ شرعاً واجب ہو جاتا ہے' اس لئے وہ طلوع اسلام کے خلاف الزام تراشیوں اور کذب بافیوں میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے ___ یہ منکرِ حدیث ہے۔ منکرِ شانِ رسالت ہے۔ تین نمازوں اور تیس روزوں کا قائل ہے۔ تقسیم ہند سے پہلے انگریزوں کا ایجنٹ تھا۔ اب حکومت کا پٹھو ہے وغیرہ وغیرہ ہفوات کا مسلسل پراپیگنڈہ جاری رکھا گیا۔ لیکن چونکہ طلوع اسلام کے نزدیک' یہ جماعت' نہ صرف پاکستان بلکہ خود اسلام کے لئے شدید ترین خطرہ کا موجب ہے' اس لئے اس نے ان کے اس قدر شدید پراپیگنڈہ اور مہیب مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے حسبتہً للہ ان کی نقاب کشائی کا فریضہ جاری رکھا ___ للہ الحمد کہ حق و صداقت آخر غالب آئے اور رفتہ رفتہ قوم کی سمجھ میں یہ بات آنے لگ گئی کہ یہ جماعت فی الواقعہ ملک اور دین دونوں کے لئے کس قدر خطرناک ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مودودی صاحب کی غلط بیانیوں کی قلعی کھولنی شروع کردی۔ چنانچہ اب ہو یہ رہا ہے کہ ایک طرف سے ان کی ایک غلط بیانی کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ یہ اسے چھپانے کے لئے مزید غلط بیانی سے کام لیتے ہیں تو دوسری طرف سے ان کی چار غلط بیانیوں کو سامنے لاکر رکھ دیا جاتا ہے اس سے یہ بے حد بوکھلا اٹھے ہیں۔

۲۶ اگست کی تقریر

اس کی تازہ مثال' مودودی صاحب کی وہ تقریر ہے جو انہوں نے ۲۶ اگست کو جماعت کے یوم تاسیس کی تقریب پر کی تھی۔ اس میں انہوں نے' بایانِ تحریکِ پاکستان پر پھر کیچڑ اچھالا تو ملک میں چاروں طرف سے ان پہ لے دے شروع ہوگئی۔ اس پر انہوں نے حسبِ عادت' یہ کہنا شروع کر دیا کہ میری تقریر کو مسخ کر کے پیش کیا گیا ہے۔ میں نے یہ تو نہیں کہا تھا۔ ہم نے انتظار کیا کہ مودودی صاحب کی تقریر ان کے اپنے آرگن ___ ایشیا ___ میں شائع ہو جائے تو پھر اس کا جائزہ لیا جائے۔ ہم نے ایشیا کی اشاعت کا بے تابی سے انتظار کیا لیکن اس نے (اپنی ۳۰ اگست کی اشاعت میں) معذرت پیش کر دی کہ "بعض وجوہ کی بنا پر" تقریر بروقت تیار نہیں ہوسکی۔ یہ تقریر آئندہ شمارہ میں پیش کی جائے گی جو نہایت تھوڑے وقفہ کے بعد سامنے آجائے گا۔ یہ شمارہ (تھوڑے وقفہ کے بجائے کافی لیٹ

یعنی) ۲۰ ستمبر کو شائع ہوا جس میں مودودی صاحب کی مکمل تقریر چھپ گئی ہے۔ اس کی تمہید میں مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ تقریر کو ایک ریکارڈ سے نقل کیا گیا ہے۔ اس میں صرف اس حد تک تصرف کیا گیا ہے کہ تقریر کی زبان کو تحریر کی زبان میں بدل دیا ہے۔ علاوہ ازیں تقریر میں بعض مقامات پر تشریحی حاشیے بھی دیئے گئے ہیں۔ یہی تقریر اس وقت ہمارے سامنے ہے۔

تقریر بڑی لمبی ہے اور حسبِ معمول 'الفاظ کے گورکھ دھندے' (JUGGLERY OF WORDS) کا بڑا دلچسپ مجموعہ۔ اس کی (THEME) یہ ہے کہ مودودی صاحب ہنوز سولہ سترہ برس کے نوجوان تھے جب انہوں نے ہندوستان کی مختلف تحریکات کا مطالعہ شروع کیا، اور ہر تحریک میں جو نقائص ان کی نگہِ ژرف بین نے دیکھے ان کا اندازہ کسی اور کو نہیں ہوا۔ اور بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ انہوں نے جو کچھ سمجھا تھا بالکل صحیح تھا۔ اگر ہم پوری کی پوری تقریر کا جائزہ لیں تو ــــ سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے ــــ اس لئے ہم اپنے آپ کو سردست اس موضوع تک محدود رکھتے ہیں کہ انہوں نے تحریکِ پاکستان اور اس کے بانیوں کے متعلق کیا کہا ہے اور اس میں کس قدر غلط بیانیوں سے کام لیا ہے۔ (تقریر کے دیگر اقتباسات کو کسی دوسری نشست میں سامنے لایا جائے گا۔)

(٠)

مودودی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا ہے۔

سنہ ۱۹۴۰ء کے کوائف

جس وقت تحریکِ پاکستان اٹھی اور ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاس ہوئی.... اس وقت جو اہم ترین سوالات میرے سامنے تھے وہ یہ تھے کہ حالات جس رخ پر جا رہے ہیں ان میں ایک شکل تو یہ پیش آ سکتی ہے کہ پاکستان کے لئے کوشش کر کے مسلم لیگ ناکام ہو جائے اور ہندوستان میں انگریز واحد ہندوستانی قومیت کی بنیاد پر ایک جمہوری حکومت قائم کر کے اسے ہندوؤں کے حوالے کر کے چلا جائے۔ اس صورت میں کیا کرنا ہوگا؟[1] دوسری شکل یہ پیش آ سکتی ہے کہ مسلم لیگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے اور ملک تقسیم ہو جائے۔ اس صورت میں جو کروڑوں مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے ان کا کیا حشر ہوگا؟[2] اور خود پاکستان میں اسلام کا کیا حشر ہوگا جس قسم کے عناصر پاکستان کی تحریک

---

[1] قاضی کو شہر کا اندیشہ! کیا مسلم لیگ کے راہ نما (بالخصوص قائداعظمؒ) اس کے لئے کچھ نہ کرتے؟

[2] یہ صورت تو پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے لئے آپ نے کیا کیا؟ پاکستان کی طرف بھاگ آئے! (طلوعِ اسلام)

ہیں شامل ہو رہے تھے ان کو دیکھتے ہوئے میں یقینی طور پر سمجھ رہا تھا کہ یہ عناصر جمع ہو کر ایک ملک بنا سکتے ہیں۔ ایک قومی حکومت قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن ان عناصر سے کبھی یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ یہ ایک اسلامی حکومت بنا لیں گے۔ میں اس کو بالکل صاف دیکھ رہا تھا کہ مسئلہ ایک شخص یا چند اشخاص کا نہیں ہے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ اس تحریک میں جو لوگ شامل ہو رہے تھے۔ جو اس میں پیش پیش تھے۔ جو اس تحریک کو چلا رہے تھے، ان کے کیریکٹر کو دیکھتے ہوئے، ان کی زندگیوں کو دیکھتے ہوئے، ان کی تعلیم، ان کے خیالات اور ان کی ہر چیز کو دیکھتے ہوئے اللہ سے کیا توقعات وابستہ کی جا سکتی تھیں ..... (میرے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ) جو ملک مسلمانوں کے حصہ میں آئے گا اس کو مسلمانوں کی کافرانہ حکومت بننے سے کیسے بچایا جائے۔

یعنی تشکیلِ پاکستان سے پہلے کی بات۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد

ہم نے محسوس کیا کہ پاکستان بنانے والوں کا ارادہ ہرگز یہاں ایک اسلامی حکومت قائم کرنے کا نہیں۔

اس فقرے کے نیچے حسبِ ذیل نوٹ دیا گیا ہے۔

میرے اس فقرہ کو یہ معنی پہنانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بانیانِ پاکستان کا شروع ہی سے پاکستان کو ایک اسلامی حکومت بنانے کا ارادہ نہیں تھا۔ پھر اس میں مزید شرارت سے یہ معنی بھی پیدا کر لئے گئے ہیں کہ دراصل میں نے اس فقرے میں قائداعظم مرحوم پر حملہ کیا ہے حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ ... پاکستان بنانے والوں سے میری مراد وہ بہت سے متضاد عناصر ہیں جو تحریکِ پاکستان کو مقبول اور کامیاب ہوتے دیکھ کر نہ صرف اس میں شامل بلکہ پیش پیش ہو گئے تھے اور ان کے متعلق بھی میں نے یہ نہیں کہا ہے کہ ان کا ارادہ شروع ہی سے پاکستان کو اسلامی حکومت بنانے کا نہ تھا: بلکہ یہ کہا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد ان کے طرزِ عمل سے ہمیں یہ محسوس ہوا کہ وہ اس ملک کو اسلامی ریاست بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔

ان اقتباسات کی رُو سے مودودی صاحب نے دو باتیں کہی ہیں۔

(۱) انہوں نے مسلم لیگ کے دیگر راہ نماؤں کے خلاف تو بے شک بہت کچھ کہا تھا لیکن قائداعظمؒ کے خلاف کچھ نہیں کہا تھا۔ اور

(۲) انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ تحریکِ پاکستان کے بانیوں کا شروع ہی سے پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کا ارادہ نہیں تھا۔ انہوں نے کہا یہ تھا کہ پاکستان بننے کے بعد ان لوگوں کا یہ ارادہ نہیں رہا تھا۔

قائداعظمؒ کے خلاف مودودی صاحب نے کچھ کہا تھا یا نہیں، اسے ہم ذرا آگے چل کر دیکھیں گے۔ بہرحال دوسرے اعتراض کو لیجئے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ان لوگوں کا شروع میں تو ارادہ یہ تھا کہ پاکستان کو اسلامی مملکت بنایا جائے گا لیکن حصولِ پاکستان کے بعد ان کی نیت بدل گئی اس لئے مجھے (یعنی مودودی صاحب کو) ان کی مخالفت کرنی پڑی۔ یہ وہ لوگ تھے جو تحریکِ پاکستان کو مقبول اور کامیاب ہوتے دیکھ کر بعد میں شامل بلکہ پیش پیش ہو گئے تھے۔" اس سے پہلے مودودی صاحب اسی تقریر میں کہہ چکے ہیں کہ

> ۱۹۴۰ء میں قرار دادِ پاکستان پاس ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت کوئی شخص بھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ملک یقیناً تقسیم ہو جائے گا اور پاکستان ضرور بن جائے گا۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۷ء کے آغاز تک بھی یہ بات یقینی نہیں تھی کہ پاکستان واقعی بن جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ جب ۱۹۴۷ء کے آغاز تک بھی یہ بات یقینی نہیں تھی کہ پاکستان واقعی بن جائے گا تو وہ کونسا زمانہ تھا جس میں متضاد عناصر پاکستان تحریک کو کامیاب ہوتے دیکھ کر اس میں شامل بلکہ پیش پیش ہو گئے تھے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ جب آپ نے (مودودی صاحب نے) ۱۹۴۰ء ہی میں دیکھ لیا تھا کہ جو لوگ تحریکِ پاکستان میں پیش پیش تھے، ان کا کیریکٹر، ان کی زندگی۔ ان کی تعلیم۔ ان کے خیالات۔ ان کی ہر بات اس کی شاہد ہے کہ وہ ایک اسلامی ریاست بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہی بنا سکتے ہیں۔ تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ ان کا ارادہ پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے کا تھا یا نہیں۔ وہ ہزار ارادے کرنے کے باوجود آپ کے خیال کے مطابق پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے اہل ہی نہیں رکھتے۔

تیسری بات یہ کہ کیا آپ نے حصولِ پاکستان سے پہلے کبھی، کسی وقت بھی یہ کہا تھا کہ ان لوگوں کا ارادہ تو یہ ہے کہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنایا جائے لیکن ان میں اس کی صلاحیت نہیں ہے۔ کیا آپ (یعنی مودودی صاحب) اپنی کوئی تحریر ایسی دکھا سکتے ہیں جس میں آپ نے ایسا کہا ہو؟

(۵)

اب آیئے اس سوال کی طرف کہ آپ نے تحریکِ پاکستان کے راہ نماؤں کے خلاف جو گند اچھالا تھا، کیا وہ ان لوگوں کے خلاف تھا جو تحریکِ پاکستان کی کامیابی کو دیکھ کر اس میں بعد میں شامل ہو گئے تھے، یا وہ اس تحریک کے اسابقون الاولون کے خلاف بالعموم اور خود قائداعظمؒ کے خلاف بالخصوص تھا۔

قارئین سے درخواست ہے کہ اس سلسلہ میں دو ایک باتیں خاص طور پر ذہن میں رکھیں۔

مودودی صاحب کو کب معلوم ہوا تھا

(۱) مودودی صاحب نے، قائداعظمؒ کے تیسویں یومِ وفات

پر فوی مجلس (لاہور) کے نام اپنے ایک پیغام میں کہا ہے کہ

قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد قائداعظمؒ نے لادین اور سوشلسٹ عناصر کی خواہشات کے بالکل برعکس واضح الفاظ میں اعلان کر دیا تھا کہ پاکستان میں اسلام کا سماجی نظام رائج کیا جائے گا۔

(مساوات ۔ مورخہ ۹/۷ ۱۱)

(اسے ذہن میں رکھیئے کہ قرارداد پاکستان مارچ سنہ ۱۹۴۰ء میں منظور ہوئی تھی)

یہاں مودودی صاحب نے کہا ہے کہ قائداعظم نے مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کے بعد یہ اعلان کر دیا تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام رائج کیا جائے گا۔ لیکن اس سے پہلے وہ کہہ چکے ہیں کہ

> سنہ ۱۹۳۷ء تک یہی حالت رہی۔ لیکن ففروا الی اللّٰہ کی پکار کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان ان سب سیاسی نصب العینوں سے مایوس ہو کر یہ محسوس کرنے لگے کہ ان کی نجات اسلام میں ہے۔۔۔۔ مسلم لیگ نے اس نصب العین کو اپنا لیا تھا۔ اس کے لیڈروں نے ایک خالص اسلامی سلطنت کے قیام کے خواب کی تصدیق کی اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری مسلمان قوم اس کے علم تلے جمع ہو گئی۔[1]
>
> (ایشیا ۔ ۸/۶۸ ۲۵)

اس کے ایک سال بعد مودودی صاحب نے کہا تھا۔

> اگر تحریکِ پاکستان کے آغاز میں یہ نہ کہا جاتا کہ پاکستان اسلامی شریعت کے نفاذ اور اسلامی نظامِ زندگی قائم کرنے کے لئے بنانا مطلوب ہے تو اس تحریک کو کبھی مسلمانوں کی تائید حاصل نہ ہوتی اور نہ ہی یہ ملک وجود میں آتا۔ (ایشیا ۔ ۸/۶۹ ۲۰)

اس کے چند ہی روز بعد انہوں نے کہا۔

> قائداعظمؒ کو اس امر کا بخوبی اندازہ تھا کہ مسلمانوں کی قوت، بقاء، اور نشوونما کا اصل سرچشمہ اسلام ہے۔ اس لئے انہوں نے بار بار اس کا اعلان کیا کہ پاکستان میں اسلامی جمہوری نظام قائم

---

[1] یہ تحریر ایشیا کے اداریہ میں تھی۔ ہم اس وقت یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ یہ الفاظ مودودی صاحب کے تھے یا ایشیا کے۔ لیکن صورت کوئی بھی ہو، یہ واضح ہے کہ ان حضرات کو اس کا اعتراف ہے کہ سنہ ۱۹۳۷ء ہی سے مسلم لیگ نے اپنا یہ نصب العین مقرر کر لیا تھا۔

کیا جائے گا۔ (نوائے وقت ۔ ۱۱ ۹/۴۹)

اس سے بھی بہت پہلے، انہوں نے کہا تھا۔

> یہ امر اپنی جگہ مسلّم ہے کہ نظریۂ پاکستان کے بانی اور تحریکِ پاکستان کے قائد ہر موقع پر مسلمانوں کو یہی کہتے رہے کہ اس ملک کے قیام کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ یہاں اسلام کی ایک ایسی تجربگاہ قائم کی جائے جس سے مادی تہذیب سے ستائی ہوئی انسانیت آرام و سکون حاصل کر سکے۔ (ترجمان القرآن ۔ ستمبر ۱۹۴۵ء)

آگے بڑھنے سے پیشتر ہم مودودی صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ جس جماعت (مسلم لیگ) کے اغراض و مقاصد یہ تھے، کیا ــ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰی ــ کے ارشادِ خداوندی کی رُو سے، آپ کا یہ فریضہ نہیں تھا کہ آپ اس جماعت کے ساتھ تعاون کرتے اور ان میں اگر کوئی نقائص تھے تو ان کے ایک رفیق کی حیثیت سے ان کی اصلاح کی کوشش کرتے، بالخصوص جب آپ اسے بھی تسلیم کر چکے ہیں کہ اُس وقت اِن لوگوں کا ارادہ بھی یہی تھا کہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنایا جائے! ہے آپ کے پاس اس کا کوئی جواب؟

(۰)

اب آیئے اس سوال کی طرف کہ مودودی صاحب نے قائداعظمؒ اور تحریکِ پاکستان کے اوّلین راہنماؤں کے خلاف کیچڑ اچھالا تھا یا نہیں! یہ آپ دیکھ چکے ہیں کہ مودودی صاحب کے اپنے بیانات کے مطابق، یہ حضرات (بانیانِ تحریکِ پاکستان، بشمول قائداعظمؒ) (۱) تحریکِ پاکستان کے آغاز ہی سے، یا (۲) ۱۹۳۶ء کے بعد، یا (۳) قراردادِ پاکستان کی منظوری (یعنی مارچ ۱۹۴۰ء) کے بعد سے بار بار اس کا اعلان کرتے رہے کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم کیا جائے گا۔ (اسے اچھی طرح ذہن میں رکھیئے)۔

سیاسی کشمکش حصہ سوم کب شائع ہوئی تھی

مودودی صاحب نے قائداعظمؒ اور مسلم لیگ کے دیگر قائدین کے خلاف جو کچھ لکھا تھا، وہ ان کی کتاب (سیاسی کشمکش، حصہ سوم) میں شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کے متعلق مودودی صاحب نے اپنی تقریر (۲۶ / اگست ۱۹۷۰ء) میں کہا ہے۔

> اس غرض کے لئے میں نے وہ سلسلہ مضامین لکھنا شروع کیا جو بعد میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے مضامین زیادہ تر

سنہ ۱۹۳۹ء سے سنہ ۱۹۴۰ء تک لکھے گئے تھے اور اس کا کچھ حصہ سنہ ۱۹۴۱ء کا لکھا ہوا ہے۔

اس سے مودودی صاحب یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ انہوں نے سیاسی کشمکش حصہ سوم میں جو کچھ قائداعظمؒ اور دیگر زعمائے لیگ کے خلاف لکھا تھا وہ قرار دادِ پاکستان منظور ہونے سے پہلے کے زمانے (یعنی سنہ ۱۹۳۹ء سے سنہ ۱۹۴۰ء) میں لکھا گیا تھا۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں اس کتاب کا کچھ حصہ لکھا تھا۔ اس میں جو لفظی تلبیس ہے وہ قابلِ داد ہے۔ واقعہ یہ ہے۔

وہ سلسلۂ مضامین جو بعد میں سیاسی کشمکش حصہ سوم کے نام سے شائع ہوا تھا پہلے ترجمان القرآن کی دو اشاعتوں میں شائع ہوا تھا۔ پہلا شمارہ ذی الحجہ سنہ ۱۳۵۹ھ مطابق فروری سنہ ۱۹۴۱ء کا تھا۔ اور دوسرا شمارہ محرم سنہ ۱۳۶۰ھ مطابق مارچ سنہ ۱۹۴۱ء کا ــــ یعنی قرار دادِ پاکستان کی منظوری کے ایک سال بعد۔ انہی دونوں شماروں کے مضامین بعد میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیے گئے تھے۔ ہمارے پاس ترجمان القرآن کے وہ دونوں شمارے بھی موجود ہیں اور سیاسی کشمکش حصہ سوم کا وہ ایڈیشن بھی جسے مودودی صاحب نے "آرمی پریس۔ دہلی" میں چھپوا کر مکتبۂ جماعتِ اسلامی' دارالاسلام' پٹھانکوٹ سے شائع کیا تھا۔ اس مجموعہ کے آخر میں 'صرف جماعتِ اسلامی کی تشکیل اور دستور سے متعلق چند صفحات کا اضافہ کیا گیا تھا۔ اور لکھا تھا کہ "شعبان سنہ ۱۳۶۰ھ (اگست سنہ ۱۹۴۱ء) میں ہم نے ان لوگوں کا اجتماع منعقد کیا اور باہمی مشورہ سے جماعتِ اسلامی قائم کی جس کا دستور یہاں نقل کیا جاتا ہے۔" (صفحہ ۲۰)

اب اگر کوئی شخص مودودی صاحب پر گرفت کرے گا کہ جو مضامین فروری۔ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئے تھے، ان کے متعلق آپ نے یہ کیسے کہہ دیا کہ وہ سنہ ۱۹۳۹ء۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں لکھے گئے تھے، تو ان کا جواب یہ ہوگا کہ میں نے وہ مضامین سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء ہی میں لکھے تھے۔ میں نے یہ تو کہیں نہیں کہا کہ وہ سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء میں شائع ہوئے تھے۔ اور اس پر ان کے حلقہ بگوش شور مچا دیں گے کہ دیکھئے۔ مولانا صاحب پر ایک اور جھوٹا الزام لگایا گیا حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ محض الفاظ کی جادوگری ہے ..... یہ واضح ہے کہ کسی مضمون یا کتاب کی ذمہ داری تاریخ اشاعت سے ہوتی ہے نہ کہ اس کے مسودہ کی تحریر کی تاریخ سے۔ مودودی صاحب نے جب یہ مضامین سنہ ۱۹۴۱ء میں شائع کئے ہیں تو (ان کے اپنے بیان کے مطابق) انہیں اس سے کم از کم ایک سال پہلے سے اس کا علم تھا کہ قائداعظمؒ نے اس باب میں کیا اعلان کیا تھا۔ اس علم کے باوجود ان مضامین میں وہ کچھ شائع کرنا جس کا ذکر ذرا آگے چل کر آتا ہے، اور اس "جرم" کو اس عذر کے لبادہ میں چھپانا کہ وہ مضامین سنہ ۱۹۳۹-۴۰ء کے لکھے ہوئے تھے، صریح تلبیس نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر مودودی صاحب نے وہ کچھ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء سے پہلے لکھا بھی تھا، تو اس کے بعد اس مسودہ کو ضائع کر دینا چاہیئے تھا۔ انہوں نے نہ اسے ضائع کیا اور نہ کہیں معذرت

کی ۔ بلکہ دعوتیہ سے اسے شائع کیا ۔۔۔ پہلے رسالہ میں اور پھر کتاب کی شکل میں ۔ اس کا ان کے پاس کیا جواب ہے ؟

(۷)

اب آگے بڑھیئے ۔ مودودی صاحب کا حالیہ اعلان آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ قائداعظمؒ نے مارچ ۱۹۴۰ء میں حتمی طور پر کہہ دیا تھا کہ پاکستان اسلامی نظام کے قیام کے لئے حاصل کیا جائے گا ۔ اس اعلان کے بعد سیاسی کشمکش حصہ سوم کی یہ تحریر پڑھیئے جو مارچ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تھی ۔

مخالفت اور غلط بیانیاں

اس موقعہ پر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمع نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے ۔

(ترجمان القرآن ۔ مارچ ۱۹۴۱ء صفحہ ۲۷ ۔ سیاسی کشمکش حصہ سوم صفحہ ۱۳۰)

یعنی قرارداد پاکستان کے ایک سال بعد بھی یہ حضرت مسلمانوں سے یہ کہہ رہے تھے کہ لیگ کے کسی ذمہ دار لیڈر نے آج تک یہ بات واضح نہیں کی کہ ان کا مطمع نظر پاکستان میں اسلامی نظام رائج کرنا ہے ، جبکہ (ان کے موجودہ بیان کے مطابق) انہیں علم تھا کہ خود قائداعظمؒ نے ایک سال پہلے اس کا اعلان کر دیا تھا اور وہ (انہی کے بیان کے مطابق) اس بات کو بار بار دہرایا بھی کرتے تھے ۔ قائداعظمؒ بار بار پاکستان کے اس مقصد کو دہراتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ

> اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی ...... بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت ۔
>
> (ترجمان القرآن ۔ مارچ ۱۹۴۱ء ۔ صفحہ ۲۹ ، ۲۸ ۔ سیاسی کشمکش حصہ سوم ۔ صفحہ ۱۳۱ ، ۱۳۲)

اب آیئے قائداعظمؒ کی طرف ۔ ان کے متعلق مودودی صاحب نے تحریر فرمایا تھا ۔

> افسوس کہ لیگ کے قائداعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو ۔
>
> (ترجمان القرآن ۔ فروری ۱۹۴۱ء ۔ صفحہ ۴۴ ، ۴۳) (سیاسی کشمکش صفحہ ۳۷)

اور سنیئے ۔

> (یہ وہ لوگ ہیں) جن کے خیالات ، نظریات ، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی ۔
>
> (ترجمان القرآن ۔ فروری ۱۹۴۱ء صفحہ ۴۶ ، ۴۵ ۔ سیاسی کشمکش صفحہ ۴۷)

ایک اور۔

یہ (لوگ) مسلمانوں کی قوم میں پیدا ہوئے ہیں اسلئے "مسلمانوں کی حکومت" ان کا نصب العین بن گیا ہے۔ یہی ہندوؤں میں پیدا ہوئے ہوتے تو مونجے اور ساورکر بنتے۔ جرمنی میں پیدا ہوتے تو ہٹلر اور گوئرنگ کے روپ میں نمودار ہوتے۔ کسی اطالوی کی آغوشِ محبت میں جنم لیتے تو مسولینی کی صورت اختیار کرتے۔

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۴۱ء۔ بحوالہ سیاسی کشمکش حصہ ۳)

قائداعظمؒ پر پھبتی

جماعتِ اسلامی کے ترجمان (ایشیا) کے اداریہ کا اقتباس آپ پہلے دیکھ چکے ہیں جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ ۱۹۳۶ء ہی سے مسلم لیگ نے اپنا نصب العین پاکستان میں اسلامی نظام کا قیام قرار دے لیا تھا۔ لیکن اسی (ایشیا) کے مدیر نصر اللہ خان صاحب عزیزؔ نے اپنے اخبار (کوثر) کی ۱۳ جنوری ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں قائداعظمؒ کی شان میں ایک قصیدہ ارشاد فرمایا تھا جس کا عنوان تھا۔

ضرورت ہے ایک ہٹلر اور مسولینی کی

اور اس کے بعد لکھا تھا۔

اس زمانے میں ہٹلر نے جرمنی میں اور مسولینی نے اٹلی میں ظہور کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اپنی قوم کو زمین کی پستی سے اٹھا کر آسمان کی رفعت پر بٹھا دیا۔ مسلمانوں نے دوسروں کو اس طرح ترقی کرتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے بھی اپنے اشتہار کی عبارت بدل ڈالی۔ اب ان کے اظہارِ خیال کے صفحات پر یہ مضمون نظر افروز تھا۔

ضرورت ہے ایک ہٹلر اور مسولینی کی

بالآخر ان کی اشتہار بازی کامیاب ہوئی اور مسٹر جناح نے اپنی درخواست قیادت قوم کے حضور گذران دی ...... قائداعظم نے بھی اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیا کہ مہدی علیہ السلام نہ سہی، مگر مالوی، مونجے، ہٹلر اور مسولینی کی طرح تو وہ قوم کی خدمت کر ہی سکتے ہیں۔

(بحوالہ مولانا مودودی، دعاوی اور عمل۔)

یہ جنوری ۱۹۴۷ء کی بات ہے۔ ۱۸ اپریل ۱۹۴۷ء کو ٹونک میں اسلامی جماعت کا ایک اہم جلسہ ہوا جس میں

۱۹۴۷ء میں مخالفت

مودودی صاحب سے یہ سوال کیا گیا کہ جب غیر مسلم (انگریز اور ہندو) مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دینے تک کے درپے ہو رہے ہیں تو کم از کم اس حد تک ہی

ہمیں مسلم لیگ کا ساتھ نہ دینا چاہیئے کہ مسلمان ان دشمنوں کی غلامی سے نجات حاصل کر سکے۔ اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا۔

جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس منہ سے ایک مسلمان سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیا جائے۔ (ترجمان القرآن جلد نمبر ۳ - عدد نمبر ۲)

یہ اس تحریک کے متعلق کہا جا رہا ہے جس کے متعلق (مودودی صاحب کے اعتراف کے مطابق) مارچ ۱۹۴۰ء میں اعلان کر دیا گیا تھا کہ اس کا مقصد پاکستان میں اسلامی نظام قائم کرنا ہے۔

——— (٠) ———

پاکستان کے بعد مخالفت

پاکستان بن گیا اور قائداعظمؒ نے بکمال کشادہ نگہی ان لوگوں کو جو آخر دم تک پاکستان اور خود قائداعظمؒ کے خلاف اس قدر دریدہ دہنی سے کام لیتے چلے آ رہے تھے، اپنے سایۂ عاطفت میں پناہ دی۔ لیکن ان حضرات کی طرف سے اس کا ردعمل کیا ہوا، اسے بھی سن لیجئے۔ ترجمان القرآن کا پہلا پرچہ جون ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا جس میں ہندوستان کی مختلف تحریکات کا بالعموم اور تحریک پاکستان کا بالخصوص تجزیہ کرنے کے بعد مودودی صاحب نے لکھا کہ

یہ بحث ان لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلے ربع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔

۱۹۴۸ء سے ماقبل کے پچیس سالوں (ربع صدی) میں کون کون سے حضرات نے مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی تھی، اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ مودودی صاحب نے ایک ہی جھاڑو سے ان سب کا منہ کالا کر دیا۔

اس کے بعد جولائی ۱۹۴۸ء کے شمارہ میں تحریک پاکستان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔

(اس میں) عام کارکنوں سے لے کر بڑے بڑے ذمہ دار لیڈروں تک میں انتہائی ناقابلِ اعتماد سیرت کے لوگ موجود تھے۔

ظاہر ہے کہ "بڑے بڑے ذمہ دار لیڈروں" میں خود قائداعظمؒ کا نام سرفہرست آئیگا۔ پھر اگست ۱۹۴۸ء کے ارشادات میں فرمایا کہ

اس پورے گروہ میں ایک کو بھی نہ نکلا جو بازی کھو دینے کے بعد سر دے سکتا۔ ساری جماعت بازی گروں سے پٹی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب کلا بازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت

اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے بنے ہوئے تھے

یہ کچھ اس وقت کہا جا رہا تھا جب قائد اعظمؒ زندگی کے آخری سانس لے رہے تھے! وہی قائد اعظمؒ جن کے متعلق مودودی صاحب نے قومی مجلس لاہور کے نام اپنے حالیہ بیان میں کہا ہے کہ

> بانیٔ ملت نے انگریزوں، ہندوؤں اور سکھوں کی متحدہ طاقت کا مقابلہ کر کے دنیا کے نقشہ پر سب سے بڑا مسلم ملک قائم کر دیا۔　　　(مساوات - ۹/۷ ۱۱)

(۸)

چہ دلاور است دزدے

یہ ہے نمونہ ان ارشاداتِ عالیہ کا جو مودودی صاحب نے قائد اعظمؒ کے خلاف ۱۹۳۸ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک ارزانی فرمائے۔ اور جس کے بعد آپ پوری ڈھٹائی سے کہہ رہے ہیں کہ میں نے قائد اعظمؒ کے خلاف تو کبھی کچھ نہیں کہا۔ چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد۔

سائیکالوجی کی رو سے ایک نفسیاتی مرض ہے جسے (SADISM) کہتے ہیں۔ اس مرض کا مریض دوسروں کو تکلیف دینے میں بڑی لذت محسوس کرتا ہے۔ اس سے اس کی انانیت کی تسکین ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے مودودی صاحب اس مرض میں مبتلا ہیں، وہ دوسروں کی تحقیر و تذلیل میں بڑی لذت محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ بڑے نخرے سے لکھتے ہیں۔

> میں نے اب تک کوئی چیز ایسی نہیں لکھی ہے جس پر کسی نہ کسی گروہ کو چوٹ نہ لگی ہو۔ اور اگر میں یہ فیصلہ کر لوں کہ کوئی ایسی چیز نہ لکھی جائے جو مسلمانوں کے کسی گروہ کو ناگوار نہ ہو، تو شاید کچھ بھی نہ لکھ سکوں۔

(رسائل و مسائل حصہ اول - صفحہ ۲۸۳ - پہلا ایڈیشن ۱۹۵۱ء)

لیکن اس کے ساتھ ہی مصیبت یہ ہے کہ مودودی صاحب اس اخلاقی جرأت سے عاری ہیں کہ وہ دوسروں پر اس قسم کی چوٹیں کرنے کے بعد سینہ تان کر اقرار کریں کہ ہاں میں نے ایسا کہا ہے اور ہزار بار ایسا کہوں گا۔ وہ دوسروں کے خلاف جو جی میں آئے کہتے بھی چلے جاتے ہیں اور جب اس پر گرفت کی جائے (یا جب چار ووٹ چھننے کا خطرہ ہو) تو پھر اس سے حیث مکر بھی جاتے ہیں۔ لیکن مکرتے ہیں اس بھونڈے طریقے سے کہ دوسرے ہی سانس میں اس کی قلعی کھل جاتی ہے۔ (SADISM) کی لذت اور اس اخلاقی جرأت کے فقدان کا نتیجہ وہ قلبی اضطراب ہے جس میں وہ آجکل بری طرح سے مبتلا ہیں۔ اسے

خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں جس میں دیر تو ہو سکتی ہے' اندھیر کبھی نہیں ہوتا۔ اگر مودودی صاحب کو عمر کے اس آخری حصہ میں توبہ کی سعادت نصیب ہو جاتی تو وہ زندگی کے اس قدر الم انگیز اور ذلت آمیز انجام سے بچ جاتے۔ لیکن توبہ کے لئے تو بڑی جراءت کی ضرورت ہوتی ہے' اور توبہ کے بغیر خدا کا عذاب ٹل نہیں سکتا۔ لہذا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَمَا ثُقِفُوا۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

پس تحریر — ایک اور شہادت

جماعتِ اسلامی سے متعلق حضرات اس واقعہ کو بڑے فخر سے بیان کیا کرتے ہیں کہ مسلم لیگ نے اسلامی آئین کی ترتیب کے لئے ایک کمیٹی بنائی تھی جس میں مودودی صاحب کو بھی ایک رکن کی حیثیت سے منتخب کیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے متعین طور پر کبھی نہیں بتایا۔ کہ وہ کمیٹی کب متشکل کی گئی تھی۔ ہمارے اس وقت کے پیشِ نظر موضوع کے اعتبار سے یہ واقعہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ دار المصنفین (اعظم گڑھ) کی طرف سے ۱۹۵۳ء میں ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس کا عنوان تھا "اسلام کا سیاسی نظام"۔ اس کا پیش لفظ مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا تھا۔ اس میں انہوں نے فرمایا تھا۔

یہ کتاب جو آپ کے پیشِ نظر ہے' اپنی تسوید و تالیف کی ایک مختصر سی، گو ذرا افسوسناک تاریخ بھی رکھتی ہے۔ سنہ غالباً ۱۹۴۰ء تھا یا شاید اس سے بھی کچھ قبل جب مسلم لیگ کا طوطی ہندوستان میں بول رہا تھا کہ اربابِ لیگ کو خیال یہ پیدا ہوا کہ ————

—— جس اسلامی حکومت (پاکستان) کے قیام کا مطالبہ شد و مد سے کیا جا رہا ہے خود اس کا نظام نامہ یا قانونِ اساسی بھی تو خالص اسلامی بنانا چاہیئے۔ اور اسی غرض کے لئے یو۔ پی کی صوبہ مسلم لیگ نے ایک چھوٹی سی مجلس ایسے ارکان کی مقرر کر دی جو اس کے خیال میں شریعت کے ماہرین تھے کہ یہ مجلس ایسا نظام نامہ مرتب کر کے لیگ کے سامنے پیش کرے۔ اس مجلسِ نظامِ اسلامی کے چار ممبران کے نام تو اچھی طرح یاد ہیں

(۱) مولانا سید سلیمان ندوی (۲) مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی

(۳) مولانا آزاد سبحانی (۴) مولانا عبدالماجد دریابادی

باقی دو ممبر غالباً اور تھے۔ ان کے نام اب ذہن میں نہیں۔ مسلم لیگ کی فراخ مشربی اس سے

واضح ہے کہ اس مجلس کے بیشتر ممبر لیگ کے ممبر نہ تھے۔

اس کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ طے یہ پایا تھا کہ اس آئین کا خاکہ مولانا حکیم محمد اسحاق سندیلوی (ندوی) تیار کریں جس کی ایک نقل ہر ممبر کے پاس بھیجی جائے۔ یہ ارکان اس پر نقد و تبصرہ کریں اور پھر ایکبار جمع ہو کر بحث و گفتگو کے بعد مسودہ کی آخری شکل طے کر دیں۔ چنانچہ مولانا اسحاق صاحب نے اس کا مسودہ تیار کر دیا اور اسکی نقول ممبروں کے پاس بھیجدی گئیں۔ لیکن ممبران کے یکجا کرنے اور بحث و گفتگو ہونے کی منزل کبھی نہ آسکی۔ اس مسودہ کو بعد میں کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا (جسکا پیش لفظ مولانا دریابادی نے ۱۹۴۴ء میں لکھا تھا)۔

اس سے واضح ہے کہ ۱۹۴۰ء (یا اس سے بھی قبل) مسلم لیگ نے یہ طے کر لیا تھا کہ جس مملکت کے حصول کے لئے وہ جدوجہد کر رہی ہے اس میں اسلامی نظام رائج کیا جائیگا۔ اور اس اسلامی نظام کا دستور مرتب کرنے کے لئے اس نے ایک کمیٹی بھی مقرر کر دی تھی جس کے ایک ممبر مودودی صاحب تھے (اور اس کا خود مودودی صاحب کو بھی اعتراف ہے کہ وہ اس کمیٹی کے ممبر تھے)۔ اس کے بعد مودودی صاحب، مارچ ۱۹۴۱ء میں لکھتے ہیں کہ

> مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آجتک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام قائم کرنا ہے۔
>
> (ترجمان القرآن۔ بابت مارچ ۱۹۴۱ء۔ ص [illegible])

یعنی ۱۹۴۰ء یا اس سے بھی کچھ عرصہ پہلے، مودودی صاحب مسلم لیگ کی طرف سے مقرر کردہ اس کمیٹی کے ممبر منتخب کئے گئے تھے جس کے ذمے یہ فریضہ عاید کیا گیا تھا کہ وہ پاکستان کے لئے اسلامی نظام کا دستور مرتب کریں اور مودودی صاحب ۱۹۴۱ء میں یہ تحریر فرما رہے ہیں کہ مسلم لیگ کیطرف سے آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ اس کا مطمح نگاہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم کرنا ہے۔ اگر اسکا مطمح نگاہ یہ نہیں تھا تو وہ کمیٹی کاہے کیلئے مقرر کی گئی تھی؟

اس قدر کھلی ہوئی غلط بیانی کی مثال آپ کو شاید ہی کہیں اور ملے! اور اس کے باوجود آپ دیکھینگے کہ اس جماعت کے متوسلین مودودی صاحب کو "دستور" امام حنبل" اور امام ابن تیمیہؒ کے ہم پایہ" قرار دیتے چلے جائینگے!

واضح رہے کہ ۱۹۴۰ء سے قبل کا زمانہ وہ تھا جب مودودی صاحب، متحدہ قومیت کے نظریہ کے خلاف مضامین لکھا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے تحریکِ پاکستان کے حامیوں کی نگاہ میں ان کی وقعت تھی اور مسلم لیگ کی مولہ بالا کمیٹی کی رکنیت کے لئے ان کے انتخاب کا جذبۂ محرکہ بھی غالباً یہی تھا۔ مودودی صاحب نے تحریکِ پاکستان کی مخالفت اس کے بعد شروع کی تھی۔ جب (خود مودودی صاحب کے اعتراف کے مطابق) مسلم لیگ نے یہ واضح کر دیا تھا کہ اس کا مطمح نگاہ پاکستان میں اسلامی نظام کا قیام ہے۔

——— (باقی) ———

باسمہٖ تعالیٰ

اسلامی مملکت کا خواب

(جو کثرتِ تعبیر سے پریشاں ہوگیا)

"کتاب و سنت" کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں
جس پر مسلمانوں کے تمام فرقے متفق ہوں

(مودودی صاحب)

اِسلامی مملکت کا خواب

جو کثرتِ تعبیر سے پریشاں ہو گیا

آپ طلوعِ اسلام کے فائل اٹھا کر دیکھئے۔ آپ کو نظر آئے گا کہ ہم مسلسل تیئیس سال سے یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کی موجودگی میں نہ اسلامی نظام قائم ہو سکتا ہے اور نہ ہی قانونِ شریعت رائج کیا جا سکتا ہے۔ اگر پاکستان کے مسلمان فی الواقعہ چاہتے ہیں کہ یہاں اسلامی قوانین رائج ہوں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اوّلاً مختلف فرقے اپنے مؤقف میں یہ تبدیلی پیدا کریں کہ وہ اپنی اپنی فقہ اور اپنے اپنے ہاں کی احادیث (روایات) پر جم کر بیٹھنے کے بجائے، قرآن کریم کو سند اور حجت تسلیم کریں اور اس کی روشنی میں، از سرِ نو، قوانینِ شریعت کی تدوین کریں۔ یہ وہ ضابطہ قوانین ہوگا جو تمام فرقوں کے نزدیک اسلامی قرار پا سکے گا ــــ اور ثانیاً یہاں ایسا نظامِ تعلیم رائج کیا جائے کہ ہماری آنے والی نسلیں شیعہ، سنی، حنفی، وہابی، بریلوی کے بجائے صرف مسلمان بن کر ابھریں۔ چونکہ مذہبی پیشوائیت کی بقا کا راز فرقہ بندی میں ہے، اس لئے ان کی طرف سے ہماری اس دعوت کی سخت مخالفت ہوئی۔ لیکن، اس مخالفت میں بجائے اس کے کہ ہمارے دلائل کا جواب دیا جاتا، انہوں نے (حسبِ معمول) طلوعِ اسلام پر مختلف لیبل چسپاں کرنے شروع کر دیئے ــــ یہ منکرِ حدیث ہے، منکرِ سنت ہے، منکرِ شانِ رسالت ہے۔ ایک نیا مذہب ایجاد کر رہا ہے۔ یہاں سیکولر نظام لانا چاہتا ہے (اور مقطع کا بند یہ کہ) یہ ملحد ہے کافر ہے۔ ہماری دعوت کی مخالفت کرنے والوں میں اکثریت تو ان کی تھی جن کے نزدیک شریعت نام ہے نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج یا نکاح و طلاق وغیرہ کے متعلق قوانین کا ــــ اور اسلامی نظام کے معنی یہ ہیں کہ ملک میں شرعی تعزیرات (سزائیں) رائج کر دی جائیں۔ اس لئے وہ قوانینِ شریعت کے نفاذ میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتے تھے۔ لیکن ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو سمجھتے تھے

کہ طلوع اسلام جو کچھ کہتا ہے وہ مبنی برحقیقت ہے۔ لیکن چونکہ وہ "اسلامی نظام" اور "اقامت دین" وغیرہ مجمل اصطلاحات کی آڑ میں اپنا اقتدار حاصل کرنا چاہتے تھے، اس لئے وہ اس مخالفت میں سب سے پیش پیش اور متشدد تھے۔ لیکن اب حالات نے ایسا پلٹا کھایا ہے کہ طلوع اسلام جو کچھ کہتا تھا وہ ابھر کر سامنے آرہا ہے اور اس کی مخالفت کرنے والوں کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ اب کیا کیا جائے۔

قبل اس کے کہ ہم ان تازہ حالات کو قارئین کے سامنے لائیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ (تجدید یادداشت کے لئے) ذرا تفصیل سے بتا دیا جائے کہ طلوع اسلام کی اس باب میں دعوت کیا تھی جس کی مخالفت کی جاتی تھی۔ اس سلسلہ میں (مثال کے طور پر) ذیل میں وہ مقالہ درج کیا جاتا ہے جسے طلوع اسلام بابت فروری ۱۹۶۹ء میں "قانون سازی اور علماء کرام" کے عنوان سے شائع کیا گیا تھا۔ اسے بغور ملاحظہ فرمایئے[1]

"قانون سازی اور علمائے کرام"

تشکیل پاکستان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس مملکت میں اسلامی نظام رائج کیا جاسکے اور نظام اپنی عملی شکل میں 'قوانین' کی رُو سے برتے کار آتا ہے۔ بالفاظِ دیگر کسی مملکت کا آئین ان اصولوں کا آئینہ دار ہوتا ہے جن کے مطابق وہ مملکت وجود میں آتی ہے' اور مملکت کے قوانین ان اصولوں کی عملی تعبیر کرتے ہیں۔ بنا بریں قیامِ پاکستان کے بعد سب سے اہم سوال' مملکت کے لئے آئین وضع اور قوانین مرتب کرنے کا تھا۔ صدرِ اوّل کے بعد (کہ جب امت میں فرقوں کا وجود نہیں تھا) ہماری تاریخ میں یہ پہلا موقعہ آیا تھا کہ کسی مملکت نے یہ طے کیا ہو کہ مملکت کے قوانین اسلامی ہوں۔ یعنی ایسے قوانین جن کا اطلاق مملکت میں بسنے والے تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے، ورنہ اس سے پہلے مسلمانوں کی سلطنتوں میں اُس فرقہ کا قانون نافذ ہوتا تھا جس سے مملکت کے ارباب اقتدار منسلک ہوتے تھے۔ اور چونکہ باستثنائے چند' مسلمانوں کی مختلف سلطنتوں میں ارباب اقتدار حنفی العقیدہ ہوتے تھے، اس لئے عام طور پر ان سلطنتوں میں فقہ حنفی مملکت کا قانون قرار پاتی تھی۔ اقلیتی فرقوں کے لئے اتنی رعایت رکھ دی جاتی تھی کہ شخصی معاملات میں، وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق فیصلے کر لیا کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال اسلام کے منشا کو پورا نہیں کرتی تھی۔ سب سے پہلے تو یوں کہ پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تفریق ہی غیر اسلامی ہے اور دوسرے یہ کہ کسی فرقہ کو (خواہ اس کے ماننے والے کتنی ہی اکثریت میں کیوں نہ ہوں) اس کا حق کیسے پہنچ سکتا ہے کہ وہ اقلیت کے فرقہ سے اپنی فقہ منوائے۔ اکثریت کے فیصلوں کو ملک کا قانون قرار دینا، مغربی جمہوریت کی رُو سے تو صحیح قرار پا سکتا ہے' اسلامی اصول قرار نہیں پا سکتا۔ اسلام میں صحیح اور غلط، حق اور باطل کا معیار' وہ ابدی حدود ہیں جنہیں خدا نے (بذریعہ وحی) متعین کر دیا ہے۔

[1] بہتر ہو کہ اسکے ساتھ وہ مقالہ بھی دیکھ لیا جائے جو "کیا پاکستان اسلامی مملکت بن سکتا ہے" کے عنوان سے طلوع اسلام بابت اپریل ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔

نہ کہ اکثریت (یا اقلیت یا کسی ایک فرد) کے فیصلے۔ اب ظاہر ہے کہ ایک ایسے ملک میں جس میں مسلمانوں کے مختلف فرقے بستے ہوں، ایک ایسے ضابطۂ قوانین کا مرتب کرنا جس کا اطلاق (اسلامی قوانین کی حیثیت سے) تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے، نہایت نازک اور مشکل مسئلہ تھا۔ ہم نے اس کا حل یہ تجویز کیا تھا کہ مسلمانوں کے تمام فرقوں میں، ایک (اور صرف ایک) چیز بطور قدرِ مشترک موجود ہے اور وہ ہے خدا کی کتاب — قرآنِ کریم — کی ابدیت اور محکمیت پر ایمان — اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو سکے گا جو قرآنِ کریم میں بیان کردہ احکام و اصول کے خلاف ہو، تو یہ چیز تمام فرقوں کے لئے وجہِ جامعیت بن سکے گی۔ ہماری طرف سے پیش کردہ یہ حل، قرآنِ کریم کی تعلیم کے عین مطابق تھا جس نے واضح الفاظ میں کہا ہے — وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، وہی کافر ہیں۔ اسی کو خدا نے تفرقہ مٹانے کا واحد علاج بتایا تھا جب کہا تھا — وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۳) تم سب کے سب اس ضابطۂ خداوندی کے ساتھ تمسک رہو اور آپس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔

لیکن ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اس قرآنی حل کی مخالفت ہوئی اس لئے کہ فرقوں کے مٹ جانے سے ان کا الگ الگ وجود ختم ہو جاتا تھا اور وہ چاہتے ہی نہیں کہ امت میں وحدت پیدا ہو جائے۔ اس کے لئے انہوں نے یہ تجویز کیا کہ قانون سازی کا اصول یہ ہونا چاہیئے کہ

(۱) ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ اور

(۲) شخصی قوانین میں ہر فرقہ کی کتاب و سنت کی اپنی اپنی تعبیر ہوگی۔

اس پر ہم نے گزارش کیا کہ (قطع نظر اس کے کہ شخصی اور ملکی قوانین کی یہ تفریق ہی سراسر غیر اسلامی ہے) اس اصول کے ماتحت، کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جس پر تمام فرقے متفق ہو سکیں۔ اس لئے کہ ہر فرقہ کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کی فقہ عین مطابق "سنت" ہے۔ بنا بریں آپ جو قانون بھی مرتب کریں گے، وہ فرقہ اسے خلافِ کتاب و سنت قرار دے گا جس کی فقہ اس قانون کی تائید نہیں کرے گی۔ ہماری مذہبی پیشوائیت کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ لیکن چونکہ وہ فرقوں کو مٹانا نہیں چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے اپنے قدیم حربہ سے کام لیا اور طلوعِ اسلام کے خلاف یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ یہ منکرِ حدیث، منکرِ سنت اور منکرِ رسالت ہے۔ چونکہ حدیث یا سنت کا تعلق امت کے نازک ترین گوشہ سے ہے، اس لئے ان کا یہ پراپیگنڈہ کارگر ہو گیا اور اصل سوال اس شور و غوغا میں گم ہو کر رہ گیا۔

اس گروہ کے سیاسی مہرہ بازوں نے (جن میں جماعتِ اسلامی پیش پیش ہے) اس صورتِ حال سے

یہ فائدہ اٹھایا کہ جو حکومت برسر اقتدار آئی اس کے خلاف یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ وہ ملک میں اسلامی قوانین نافذ نہیں کرتی۔ یہ لوگ مسلسل یہی شور مچاتے رہے اور ہم مسلسل یہ کہتے رہے کہ ان کے اس اعتراض کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ ان سے کہا جائے کہ آپ تمام حضرات مل کر ایک ایسا ضابطۂ قوانین مرتب کر دیجئے جسے تمام فرقوں کے مسلمان متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ اسی ضابطہ کو ملک میں نافذ کر دیا جائیگا۔ مقام اطمینان ہے کہ (بیس برس کے بعد ہی سہی) یہ بات ارباب حکومت کی سمجھ میں آ گئی۔ چنانچہ صدر مملکت (محمد ایوب خان) نے ۳۰ دسمبر کو مسلم لیگی کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

> اپوزیشن کے رہنماؤں کی طرف سے جو اعتراضات موجودہ حکومت پر کئے جا رہے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ملک میں اسلامی قوانین کو نافذ نہیں کیا جا رہا۔ صدر نے کہا کہ یہ ایک جذباتی، پیچیدہ اور نازک مسئلہ ہے۔ اگر اسلام میں مختلف فرقے موجود نہ ہوتے جس طرح کہ خدا اور رسول کی منشا تھی، تو یہ معاملہ آسان ہو جاتا۔ صدر نے کہا کہ میں نے علماء سے ہمیشہ کہا ہے کہ وہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کر کے اسلامی قانون تیار کریں اور اس کی منظوری وکلاء اور جج صاحبان سے حاصل کریں کہ یہ لوگ قانون کے ماہر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس طرح اس قانون کے حق میں عوام کی تائید بھی حاصل کریں، اسے اسمبلیوں میں پیش کر کے ان کی منظوری بھی حاصل کریں۔ اور اگر میں صدر رہا تو آنکھیں بند کر کے اس قانون پر دستخط کر دونگا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ملک میں اسلامی قانون رائج ہو اور میرے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کوئی بات نہیں ہے۔
>
> (نوائے وقت - ۳۱ دسمبر ۱۹۶۸ء)

اسلامی قانون کے نفاذ کے سلسلہ میں اگر ان حضرات کا مطالبہ خلوص اور دیانت پر مبنی ہوتا تو انہیں صدر مملکت کی اس پیشکش کو آگے بڑھ کر لبیک کہنا چاہیئے تھا۔ آپ غور فرمائیے کہ اس سے بڑھ کر مسرت انگیز بات اور کون سی ہو سکتی ہے کہ سربراہ مملکت خود دعوت دے کہ آپ حضرات ایک متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب کر دیں، صدر مملکت نے طریق کار کے سلسلہ میں جو اور تجاویز پیش کی ہیں، ان کے متعلق گفتگو کی جا سکتی ہے۔ اور ان میں ترمیم و تنسیخ بھی کرائی جا سکتی ہے لیکن یہ بعد کی باتیں ہیں۔ علماء کرام کو صدر مملکت کا یہ چیلنج فوراً قبول کر لینا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ قبول تو اس صورت میں کرتے جب انہیں یقین ہوتا کہ اس قسم کا متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب ہو سکتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک جانتا ہے کہ ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ ہزار برس سے یہ طے نہیں کر سکے کہ نماز میں ہاتھ کھلے رکھنے چاہئیں یا باندھنے چاہئیں اور اگر باندھنے چاہئیں تو

کس مقام پر ۔ گیا وہ لوگ مملکت کے لئے متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب کر سکتے ہیں ؟ کتاب و سنت کیمطابق متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب کرنا تو ایک طرف ، ہم انہیں برسوں سے کہتے چلے آرہے ہیں کہ آپ حضرات متفق طور پر یہ بتا دیجئے کہ سنت ، کہتے کسے ہیں اور یہ کونسی کتاب میں ملے گی ۔ ان کے پاس اس کا جواب بھی سوائے گالیوں کے کچھ نہیں ۔

بہرحال ، صدرِ مملکت کی اس پیشکش کے جواب میں ان کی طرف سے جس بوکھلاہٹ کا مظاہرہ ہوا ہے ، اس سے ان کے یاد بانوں سے ہوا نکل گئی ہے اور یہ حقیقت ابھر کر سامنے آگئی ہے کہ پاکستان میں اگر اسلامی قوانین کا نفاذ نہیں ہوتا تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قانون سازی کا جو اصول یہ حضرات پیش کرتے ہیں ، اس کے مطابق کوئی ایسا ضابطہ ۔ قوانین مرتب ہو نہیں سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ صدرِ مملکت کی اس پیشکش کے خلاف ، چند ایک مولوی صاحبان کے سوا ، کسی نے لب کشائی تک نہ کی ۔ چپ چپ سادھ لی ہے ۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں جنہوں نے جواب دیا ہے ۔ ان میں سے ہر ایک نے یا تو ان شرائط کو ہدفِ اعتراض بنایا ہے جو صدرِ مملکت کی طرف سے عاید کی گئی ہیں اور یا یہ کہا گیا ہے کہ فلاں فلاں قانون (مثلاً عائلی قوانین یا خاندانی منصوبہ بندی) کے خلاف علماء نے اعتراض کیا تھا ۔ انہیں کیوں نہیں منسوخ کیا گیا ۔ یہ دعویٰ کسی ایک کی طرف سے بھی نہیں کیا گیا کہ اگر صدر ان شرطوں میں فلاں فلاں تبدیلی کر دے تو ہم اس قسم کا متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب کرنے کے لئے تیار ہیں ۔

ان جوابات میں البتہ ایک چیز بطور قدرِ مشترک سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ ۱۹۵۱ء میں اکتیس علماء نے (جن میں ہر فرقے کے نمائندگان شامل تھے) بائیس نکات پر مبنی ایک مسودہ سفارشات پیش کیا تھا ۔ ایسے متفق علیہ مسودہ کی موجودگی میں ایک متفق علیہ ضابطہ قوانین کا مطالبہ چہ معنی دارد ! اس جواب سے عوام کو یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ غلط ہے کہ فرقوں کا وجود متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب کرنے کی راہ میں حائل ہے مختلف فرقوں کے علماء تو ۱۹۵۱ء میں متفق ہو چکے تھے ۔ چنانچہ مودودی صاحب نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ

> سب سے پہلے تو انہوں نے (یعنی صدرِ مملکت نے) مسلمانوں کے مذہبی تفرقوں کا ذکر اس طرح کیا ہے گویا یہی چیز اسلامی قانون کے نفاذ میں مانع ہے ۔ حالانکہ جنوری ۱۹۵۱ء میں تمام فرقوں کے مقتدر علماء نے بالاتفاق یہ طے کر دیا تھا کہ ملک کا قانون ، شریعت کی اس تعبیر پر مبنی ہوگا جسے مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت مانتی ہے اور قلیل التعداد فرقوں کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے پرسنل لاز (یعنی ان کی اپنی فقہ) کے مطابق کئے جائیں گے ۔ اس لئے شریعت کے نفاذ میں مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کی بنا پر اگر

کوئی رکاوٹ عاید ہو سکتی تھی تو وہ پہلے ہی دور کی جا چکی ہے اور اب ان اختلافات کو نفاذِ شریعت میں مانع قرار دینے کے لئے کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے۔

(نوائے وقت ۱۰ جنوری ۱۹۷۶ء)

واقعی یہ دعویٰ بہت بڑا ہے۔ اور اگر ۱۹۵۱ء میں مختلف فرقوں کے علماء کسی ضابطۂ قوانین پر متفق ہو چکے تھے تو آج ان کے اختلافات کو نفاذِ قانون کے راستے میں رکاوٹ قرار دینا بڑی زیادتی ہے۔ لہٰذا آیئے ہم دیکھیں کہ ۱۹۵۱ء میں یہ حضرات کس بات پر متفق ہوئے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ اواخر جنوری ۱۹۵۱ء میں مولوی صاحبان کی ایک کانفرنس زیر صدارت سید سلیمان ندوی (مرحوم) منعقد ہوئی تاکہ دستور پاکستان کے بنیادی اصول مرتب کئے جائیں۔ اس کانفرنس میں اکتیس مولوی صاحبان نے شرکت کی جن میں اہل فقہ، اہل حدیث، شیعہ حضرات اور کچھ پیر صاحبان بھی شامل تھے۔ ان کی طرف سے اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کے عنوان سے ایک مسودہ شائع ہوا تھا۔ اسے ہم درج ذیل کرتے ہیں۔

(۔)

مسودہ | اسلامی مملکت کے دستور میں حسب ذیل اصولوں کی تصریح لازمی ہے۔

(۱) اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العالمین ہے۔

(۲) ملک کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہوگا اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکے گا، نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جا سکے گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

(تشریحی نوٹ) اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں تو اس کی تصریح بھی ضروری ہے کہ وہ بتدریج ایک معینہ مدت تک کے اندر منسوخ یا شریعت کے مطابق تبدیل کر دیئے جائیں گے۔

(۳) مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں بلکہ ان اصول و مقاصد پر مبنی ہوگی جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطۂ حیات ہے۔

(۴) اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ قرآن و سنت کے بتائے ہوئے معروفات کو قائم کرے، منکرات کو مٹائے اور شعائرِ اسلام کے احیاء و اعلاء اور مسلمہ اسلامی فرقوں کے لئے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

(۵) اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمانانِ عالم کے رشتۂ اتحاد و اخوت کو قوی سے قوی تر کرنے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیتِ جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی، لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کر کے ملتِ اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام کرے۔

(۶) مملکت، بلا امتیازِ مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ، اور تعلیم کی کفیل ہوگی جو اکتسابِ رزق کے قابل نہ ہوں، یا نہ رہے ہوں یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسری وجوہ سے فی الحال سعیِ اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

(۷) باشندگانِ ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہونگے جو شریعتِ اسلامیہ نے ان کو عطا کئے ہیں یعنی حدودِ قانون کے اندر تحفظ جان و مال و آبرو، آزادیٔ مذہب و مسلک، آزادیٔ عبادت، آزادیٔ ذات، آزادیٔ اظہار رائے، آزادیٔ نقل و حرکت، آزادیٔ اجتماع، آزادیٔ اکتسابِ رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارات سے استفادہ کا حق۔

(۸) مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سندِ جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائیگا، اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمیٔ موقعِ صفائی و فیصلۂ عدالت کوئی سزا نہ دیجائے گی۔

(۹) مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدودِ قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انہیں اپنے پیرؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکینگے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہونگے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ انہیں کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

(۱۰) غیر مسلم باشندگانِ مملکت کو حدودِ قانون کے اندر مذہب و عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی حاصل ہوگی اور انہیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم و رواج کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

(۱۱) غیر مسلم باشندگانِ مملکت سے حدودِ شرعیہ کے اندر جو معاہدات کئے گئے ہوں ان کی پابندی لازمی ہوگی۔ اور جن حقوقِ شہری کا ذکر دفعہ ۷ میں کیا گیا ہے ان میں غیر مسلم باشندگانِ ملک اور مسلم باشندگانِ مملکت سب برابر کے شریک ہونگے۔

(۱۲) رئیسِ مملکت کا مسلمان مرد ہونا ضروری ہے جس کے تدین، صلاحیت اور اصابتِ رائے پر جمہور یا انکے منتخب نمائندوں کو اعتماد ہو۔

(۱۳) رئیسِ مملکت ہی نظمِ مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا۔ البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی جزو کسی فرد یا جماعت کو تفویض کر سکتا ہے۔

(۱۴) رئیسِ مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شورائی ہوگی۔ یعنی وہ ارکان اور منتخب نمائندگانِ جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے گا۔

(۱۵) رئیسِ مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ دستور کو کلاً و جزواً معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔
(۱۶) جو جماعت رئیسِ مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی وہی کثرتِ آراء سے اسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔
(۱۷) رئیسِ مملکت شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور حد سے قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔
(۱۸) ارکان و عمالِ حکومت اور عام شہریوں کے لئے ایک ہی قانون و ضابطہ ہوگا۔ اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کریں گی۔
(۱۹) محکمۂ عدلیہ، محکمۂ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہوگا تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہیئتِ انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔
(۲۰) ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی جو مملکتِ اسلامی کے اساسی اصول و مبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔
(۲۱) مملکت کے مختلف ولایات و اقطاعِ مملکتِ واحدہ کے اجزاء انتظامی متصور ہونگے۔ ان کی حیثیت، نسلی، لسانی، یا قبائلی وحدہ جات کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہوگی جنہیں انتظامی سہولتوں کے پیشِ نظر مرکز کی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا مگر انہیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا۔
(۲۲) دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

(۰)

طلوعِ اسلام کی تنقید

پہلے تو یہ دیکھئے کہ یہ مسودہ مملکت کے آئین کے اصولوں سے متعلق ہے اور اس وقت بات ایک ضابطہ قوانین کے مرتب کئے جانے کی ہو رہی ہے۔ آئین و قوانین میں جو بنیادی فرق ہے اسے ہر صاحبِ شعور جانتا ہے۔

پھر یہ دیکھئے کہ اس میں قوانین سازی کا وہی اصول دیا گیا ہے جو ۱۹۶۲ء کے آئین میں موجود ہے یعنی ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ یہ اصول بیشک متفق علیہ ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ اس اصول کے مطابق کوئی متفق علیہ ضابطہ قوانین بھی مرتب کیا جا سکتا ہے؟ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں "سنت" کا مفہوم اور تعین ہی تو مختلف فرقوں میں مابہ النزاع ہے۔ ان علماء نے سنت کے لفظ پر تو اتفاق کر لیا۔ سوال یہ ہے کہ سنت کے مفہوم اور تعین پر بھی ان کا اتفاق ہے، جیسا کہ ہم کئی بار وضاحت سے لکھ چکے ہیں۔ سنت کا تعین تو ایک طرف اس کی (DEFINITION) کے متعلق خود مودودی صاحب اور جمعیت اہل حدیث میں اس قدر اختلاف ہے کہ اہل حدیث حضرات، مودودی صاحب کے پیش کردہ سنت کے مفہوم کے خلاف اعلانِ جہاد کرنے پر تلے

بیٹھے ہیں۔

اس کے بعد حنفی حضرات اور اہلِ حدیث حضرات کو لیجئے۔ اہلِ حدیث حضرات کے نزدیک بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث سے انکار بھی کفر کا مستلزم ہے، اور حنفی حضرات کے نزدیک بخاری اور مسلم کی کم از کم دو سو احادیث ناقابلِ تسلیم ہیں اور جن احادیث پر فقہ حنفی کا مدار ہے، اہلحدیث ان میں سے بیشتر سے انکار کرتے ہیں۔ قرآن اور حدیث کے متعلق، حنفی حضرات کا عقیدہ کیا ہے، اس کی بابت، فقہ حنفی کے ایک مقتدر امام ابوالحسن عبیداللہ الکرخیؒ کا فتویٰ ہے کہ

> ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا تو مؤوّل ہے اور یا منسوخ۔ اور اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ مؤوّل یا منسوخ ہے۔
>
> (بحوالہ تاریخ فقہ اسلامی۔ خضری ص۳۴۲)

پھر سنّی (جن میں حنفی یعنی دیوبندی، بریلوی اور اہلحدیث سب شامل ہیں) اور شیعہ حضرات کے اختلاف کا اس سے اندازہ لگائیے کہ سنیوں کے نزدیک جس حدیث کے رواۃ میں کوئی ایک شیعہ راوی ہو وہ حدیث ناقابلِ قبول قرار پا جاتی ہے اور شیعہ حضرات کے مجموعہ ہائے احادیث، سنی حضرات کے مجموعوں سے بالکل الگ اپنے ہیں۔

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ جن علماء میں سنت (یا احادیث) کے صحیح اور غلط ہونے کے متعلق اس قدر باہمی اختلافات ہوں، ان کے متعلق یہ کہنا کہ قانون سازی کے سلسلہ میں ان سب کا اتفاق ہو گیا تھا، اگر کھلی ہوئی فریب دہی نہیں تو اور کیا ہے؟

مودودی صاحب نے اپنے حالیہ بیان میں کہا ہے کہ ۱۹۵۱ء میں

> تمام فرقوں کے مقتدر علماء نے بالاتفاق یہ طے کر دیا تھا کہ ملک کا قانون شریعت کی اس تعبیر پر مبنی ہو گا جسے مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت مانتی ہے۔

ہم نے ۱۹۵۱ء کا مسودہ، من وعن اوپر درج کر دیا ہے۔ آپ اس کی ایک ایک شق کو دیکھئے اور پھر تلاش کیجئے کہ اس میں کہیں بھی یہ کہا گیا ہے کہ "ملک کا قانون، شریعت کی اس تعبیر پر مبنی ہو گا جسے مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت مانتی ہے"۔ آپ دیکھتے ہیں کہ مودودی صاحب کس جرأت اور دیدہ دلیری سے غلط بیانی کرتے ہیں!

۱۹۵۱ء کو تو چھوڑیئے، اس وقت جن اکتیس علماء نے اس مسودہ پر دستخط کئے تھے، ان میں سے حنفی حضرات کو چھوڑ کر باقی حضرات سے پوچھئے کہ کیا وہ اس اصول سے متفق ہیں کہ ملک کا قانون شریعت کی اس تعبیر پر مبنی ہونا چاہئے جسے مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت مانتی ہے؟ ان سے پوچھئے اور پھر دیکھئے کہ آپ کو ان کی طرف سے کیا جواب ملتا ہے۔ ان کے جواب سے مودودی صاحب کے جھوٹ کی قلعی کھل جائے گی۔

اور دیگر علماء کو چھوڑیئے۔ ہم خود مودودی صاحب سے پوچھتے ہیں کہ شریعت کی جس تعبیر کو مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت مانتی ہے۔ کیا آپ خود بھی اسے کتاب و سنت کی صحیح تعبیر تسلیم کرتے ہیں؟ خود مودودی صاحب کی تشریح کے مطابق مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت فقہ حنفی کو کتاب و سنت کی صحیح تعبیر مانتی ہے۔ اس فقہ کے متعلق مودودی صاحب کے خیالات کیا ہیں؟ انہیں ذرا غور سے سنیئے۔ وہ اپنی تالیف "رسائل و مسائل" (حصہ اول) میں لکھتے ہیں۔

> امام ابوحنیفہؒ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھیں گے جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ضعیف الاسناد کو قبول کر لیا گیا ہے۔ یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کچھ اور کہتے ہیں۔ (ص ۷۷)

وہ دوسرے مقام پر لکھتے ہیں۔

> جس شخص پر کسی مسئلہ میں سنتِ رسولؐ روشن ہو جائے۔ اس کے لئے پھر کسی دوسرے شخص کا قول لینا حرام ہے خواہ وہ کیسے ہی بڑے مرتبہ کا شخص ہو۔
> (تفہیمات۔ حصہ اول ص ۲۲۵)

حنفی مسلک کا مدار تقلید ائمہ فقہ پر ہے۔ اس کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

> میرے نزدیک ایک صاحب علم کے لئے تقلید، ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔ (رسائل و مسائل۔ حصہ اول۔ ص ۲۷۳)

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ کیا ایک مجتہد کا فیصلہ ہمیشہ کے لئے واجب العمل ہو سکتا ہے، وہ فرماتے ہیں۔

> یہیں سے نبی اور مجتہد کا فرق واضح ہوتا ہے۔ نبی کی بصیرت براہِ راست علمِ الٰہی سے مستفاد ہوتی ہے اسلئے اسکے احکام تمام ازمنہ و احوال کے لئے مناسب ہوتے ہیں مگر مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو، زمان و مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اسکے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔ (تفہیمات حصہ دوم ص ۲۳۶)

فقہ حنفی میں اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ اسے مودودی صاحب وہ جامد اور بے روح مذہبیت قرار دیتے ہیں جسے آجکل اسلام کہا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ

> اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں

سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کی بجائے محض عہدِ گزشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا ہے۔ (سیاسی کشمکش۔ حصہ سوم ص۳۶)

یہ ہیں اس فقہ حنفی کے متعلق مودودی صاحب کے خیالات جسے اب وہ ملک کا قانون بنانا چاہتے ہیں اور جس کی سند وہ یہ بتاتے ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت اس کی حامل ہے۔ اس سند (یعنی اکثریت کے مسلک کے برسرِ حق ہونے) کے متعلق بھی مودودی صاحب کا فیصلہ سن لیجئے۔ وہ محولہ بالا کتاب میں لکھتے ہیں۔

> بعض لوگ اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کا نام "سوادِ اعظم" ہے۔ اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے کہ سوادِ اعظم کا ساتھ ہمیشہ دو۔ لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پارٹی کی حامی ہو اس قیادت کی متبع ہے اس کے ساتھ رہنا ضروری ہے لیکن یہ ارشادِ نبوی کی سراسر غلط تعبیر ہے۔ نبی نے جس سوادِ اعظم کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے اس سے مراد دراصل ان مسلمانوں کی اکثریت ہے جن کے اندر اسلامی شعور موجود ہو جو حق اور باطل کی تمیز رکھتے ہوں۔ اور جن کو اسلام کی روح اور اس کے بنیادی اصولوں سے کم از کم اتنی واقفیت ہو کہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق کر سکتے ہوں۔ (ص۸۰)

یہ ہے مختصر الفاظ میں اس دعویٰ کی حقیقت کہ ۱۹۵۱ء میں مختلف فرقوں کے علماء قانون سازی کے مسئلہ پر متفق ہو چکے تھے۔ اسلئے فرقوں کی موجودگی اس میں مانع نہیں ہو سکتی۔

اس ضمن میں ایک اور مغالطہ بھی دیا جاتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ قانون سازی کا متفق علیہ اصول یہ ہے کہ ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا اور شخصی قوانین کے سلسلہ میں ہر فرقہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق عمل کریگا۔ اس سے تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ مختلف فرقوں میں اختلاف صرف شخصی قوانین (پرسنل لاز) کی حد تک ہے کتاب و سنت کی روشنی میں پبلک لاز ایسے بنائے جا سکتے ہیں جو تمام فرقوں کے لئے یکساں طور پر قابلِ قبول ہوں۔ یہ دعویٰ بھی حقیقت پر مبنی نہیں۔ پبلک لاز میں بھی مختلف فرقوں میں اس قسم کے اختلافات موجود ہونگے جس قسم کے اختلافات پرسنل لاز میں ہیں۔ ہم یہاں صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں، اور اس مثال کا انتخاب بھی ہم نے خود نہیں کیا۔ کراچی کے (مولانا) احتشام الحق صاحب نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ

> کیا ملک میں شراب کو حرام قرار دینے کے بارے میں بھی کوئی فرقہ وارانہ اختلاف موجود ہے، جو اب تک خلافِ قانون قرار نہیں دی گئی۔
>
> (نوائے وقت۔ ۳ر جنوری ۱۹۶۹ء)

آیئے ہم دیکھیں کہ کیا اس باب میں بھی مختلف فرقوں میں اختلاف موجود ہے یا یہ متفق علیہ مسئلہ ہے۔

[اس کے بعد ہم نے شراب اور زنا کے دو مسائل کے متعلق وضاحت سے بتایا تھا کہ ان میں شیعہ سنی اور پھر سنیوں کے مختلف ائمہ فقہ میں کس قدر اختلافات ہیں۔ ہم بغرض اختصار ان تفصیلات کو حذف کر رہے ہیں۔ جو حضرات انہیں دیکھنا چاہیں وہ طلوع اسلام بابت فروری ۱۹۶۹ء میں دیکھ سکتے ہیں۔ ان تفصیلات کے بعد ہم نے لکھا تھا ———]

ہم سر دست انہی تفاصیل پر اکتفا کرتے ہیں، اور قارئین سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اس قسم کے اختلافات کی موجودگی میں ان حضرات علمائے کرام کا یہ ارشاد کہ فرقوں کی موجودگی، ایک متفق علیہ ضابطہ قوانین کے مرتب اور نافذ کرنے کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی، کہاں تک دیانت اور صداقت پر مبنی ہے؟ ہمارے بس میں ہوتا تو ہم ابھی انہیں اقتدار کی کرسیوں پر بیٹھا کر کہتے کہ لیجئے سرکار! اب ایک متفق علیہ ضابطہ قوانین نافذ کر کے دکھلائیے۔

یاد رکھیے۔ ایک اسلامی مملکت میں متفق علیہ ضابطہ قوانین مرتب کئے جانے کی شکل اس کے سوا کوئی نہیں کہ مختلف فرقے اپنی اپنی فقہ کو الگ رکھ کر قرآن کریم کو دین میں آخری حجت اور سند تسلیم کر لیں اور اس کی روشنی میں اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، باہمی مشورے سے از سر نو فقہ کی تدوین کریں۔ اگر وہ اس کے لئے تیار نہیں تو پھر ایک متفق علیہ ضابطہ قوانین قیامت تک مرتب نہیں ہو سکتا۔ مشکلات کا حل نہ عوام کو دھوکا دینے سے مل سکتا ہے نہ زور زور سے ڈگڈگی بجانے سے۔ ان کا حل حقائق کا سامنا کرنے ہی سے مل سکتا ہے اور اسی سے یہ گریز کرتے اور فرار کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔

——— (۰) ———

یہ ہم نے فروری ۱۹۶۹ء میں لکھا تھا اس کے بعد بھی ہم وقتاً فوقتاً اپنے ان خیالات کو دہراتے رہے اور ان حضرات کی طرف سے ہماری مخالفت ہوتی رہی۔

شیعہ حضرات کا اعتراض

کچھ دن ہوئے ادارۂ تحفظ حقوق شیعہ نے یہ سوال اٹھایا کہ پاکستان میں جس اسلامی نظام کے نفاذ کی کوشش کی جا رہی ہے اس میں شیعوں کی پوزیشن کیا ہوگی؟ اس کے جواب میں امیر جماعت اسلامی مودودی صاحب نے (جماعت کے ترجمان اخبار "ایشیا" کی ۲۳ اگست کی اشاعت میں) حسب ذیل بیان شائع کیا۔

"۲۱ اگست کے اخبارات میں سید مظفر علی شمسی صاحب جنرل سیکرٹری ادارۂ تحفظ حقوق شیعہ نے اپنی پریس کانفرنس میں جو سوالات اٹھائے ہیں وہ ان کے ادارے کی طرف سے ملک کی تمام دوسری جماعتوں کے لیڈروں کی طرح مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان کے پاس بھی بھیجے گئے تھے۔ مولانا نے ان کے جواب میں ادارہ مذکور کو جو جواب دیا وہ حسب ذیل ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے جواب میں فرمایا ہے کہ جماعت اسلامی نے کبھی یہ نہیں کہا اور نہ اسکے لٹریچر یا منشور میں کہیں آپ یہ بات پا سکتے ہیں کہ پاکستان کی ریاست کا صدر لازماً فلاں مسلک کا مسلمان ہونا چاہیئے۔ ہم صدر ریاست کے لئے صرف مسلمان ہونے کی شرط لگاتے ہیں۔ مولانا مودودی نے لکھا ہے کہ جب ہم خلافتِ راشدہ کے نمونے کی پیروی کرنے کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں سیدنا علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی خلافت کا دور بھی شامل ہوتا ہے، اور کم از کم وہ تو ہمارے اور آپ کے درمیان مشترک ہے۔ باقی رہے پہلے تین خلفاء تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ملک کے اہل سنت ان کی خلافت کو بھی خلافتِ راشدہ مانتے ہیں۔ ان کے اس عقیدے کو آپ چاہے صحیح نہ سمجھیں لیکن اس بات کو تو آپ تسلیم کرینگے کہ وہ یہ عقیدہ رکھنے کا ویسا ہی حق رکھتے ہیں جیسا آپ اپنا ایک عقیدہ رکھنے کا حق رکھتے ہیں۔ اب اگر مسلمانوں کی ایک متحدہ اسلامی ریاست قائم ہونے کے لئے یہ شرط قرار دے دی جائے کہ ملک میں جتنے مختلف مسلکوں کے مسلمان موجود ہیں، وہ سب کے سب ایک مسلک پر متفق ہو جائیں تو یہ شرط نہ کبھی پوری ہوگی نہ اس شرط کے ساتھ دنیا میں کوئی اسلامی ریاست قائم ہو سکے گی۔

کتاب سنت کی تعبیر کے معاملے میں ہمیں اور آپ کو عام ملکی قانون (پبلک لاز) اور شخصی قانون (پرسنل لاز) کے درمیان لامحالہ فرق کرنا ہوگا۔ عام ملکی قانون بہرحال کتاب و سنت کی اسی تعبیر پر مبنی ہوگا جسے اکثریت مانتی ہے۔ مراکو میں اکثریت مالکیوں کی ہے اس لئے وہاں کا پبلک لاء مالکی تعبیر پر مبنی ہوگا۔ انڈونیشیا اور ملائیشیا میں اکثریت شافعی ہے اس لئے وہاں کا پبلک لاء شافعی تعبیر پر مبنی ہوگا۔ ایران میں اکثریت شیعہ ہے، اس لئے وہاں پبلک لاء شیعہ تعبیر پر مبنی ہوگا۔ اور پاکستان میں اکثریت سنی ہے، اس لئے اگر یہاں آپ کوئی اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں تو اس کا پبلک لاء لازماً سنی تعبیر پر ہی مبنی ہوگا۔ البتہ پرسنل لاء کے معاملے میں شیعوں کے لئے شیعہ تعبیر، اہل حدیث کے لئے اہل حدیث تعبیر اور حنفیوں کے لئے حنفی تعبیر ہی مسلّم ہوگی۔ اس اصولی بات کو اگر تسلیم نہ کیا جائے تو پھر یوں کہیئے کہ ہم اور آپ انگریزی، چینی، روسی یا کسی اور غیر اسلامی قانون پر متفق ہو جائیں۔ کیونکہ کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو پبلک لاء کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہل حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔

تعلیم کے معاملے میں ہم نے اپنے منشور کے صفحہ ۱۸ پر یہ تصریح کر دی ہے کہ ثانوی تعلیم تک ہر مسلمان بچے کو لازماً اسلامی عقاید اور ضروری احکام سے واقف کرایا جائے گا اور جو مسلمان فرقے اکثریت سے مختلف عقائد رکھتے ہیں ان کے بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام ان کی مرضی کے مطابق الگ کیا جائے گا۔

مسلم اسلامی فرقوں کے حقوق ہم نے اپنے منشور کے صفحہ ۲۳ پر ٹھیک ٹھیک انہی الفاظ میں بیان کئے ہیں جو ۱۹۵۱ء میں سنی اور شیعہ علماء کے باہمی اتفاق سے اسلامی ریاست کے ۲۲ اصولوں میں طے ہوئے تھے۔ اور وہ حسب ذیل ہیں۔

- مسلم اسلامی فرقوں کو حدود و قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انہیں اپنے پیروں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا پورا حق ہوگا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی کہ انہی کے قاضی یہ فیصلہ کریں گے۔"

آخر میں مولانا مودودی نے امید ظاہر کی ہے کہ اس وضاحت سے شیعہ بھائیوں کو جماعتِ اسلامی کے متعلق کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے گی۔"

آگے بڑھنے سے پیشتر، آپ ذرا مودودی صاحب کے ان الفاظ پر غور کیجئے کہ "کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لا کے معاملہ میں حنفیوں اور شیعوں اور اہلحدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔" اور سوچئے کہ یہ وہی بات نہیں جسے طلوع اسلام تیس سال سے دہرائے چلا آ رہا ہے اور جس کی پاداش میں اسے کافر و مرتد قرار دیا گیا ہے۔ دیکھئے۔ حقیقت اپنے آپ کو کس طرح منوا لیتی ہے!

مودودی صاحب کے اس بیان کے جواب میں، ادارہ تحفظ حقوقِ شیعہ کے صدر سید اظہر حسین زیدی صاحب نے ذیل کا بیان شائع فرمایا۔

"مرکزی ادارہ تحفظ حقوقِ شیعہ کے صدر سید اظہر حسین زیدی نے امیر جماعتِ اسلامی مولانا مودودی کے آئین کے بارے میں حالیہ بیان کی پرزور مذمت کرتے ہوئے کہا کہ مولانا مودودی نے اہل تشیع کو جو ایک مسلم مسلمان فرقہ ہیں، اسلام کے دائرے سے نکال کر عیسائیوں، اچھوتوں اور دوسری غیر مسلم اقلیتوں کی صف میں کھڑا کر کے شیعہ مسلمانوں کی توہین کی ہے۔ سید اظہر حسین زیدی ایک پریس کانفرنس سے مخاطب تھے۔ انہوں نے کہا کہ چند ہفتے پیشتر میں نے تمام سیاسی جماعتوں کے سربراہوں کو مراسلے بھیجے تھے کہ اب جبکہ آپ سوادِ اعظم کے مذہبی رہنماؤں کے ساتھ مل کر ملک میں خلافتِ راشدہ کا نظام لانا چاہتے ہیں تو ایسے نظام میں مسلم اسلامی فرقہ شیعہ جو کتاب و سنت کے معانی تعلیمات محمدؐ و آلِ محمدؐ سمجھتا ہے اور پاکستان کے حصول اور تعمیر میں سوادِ اعظم کے ساتھ برابر کا حصہ دار ہے۔ اس کے مذہبی اور سیاسی جذبات کی ترجمانی کرنے کے لئے اسے کس طرح نمائندگی دی جائے گی۔

انہوں نے کہا کہ اس خط کے جواب میں مولانا مودودی نے جو آئینی خاکہ پیش کیا ہے اس کی رُو سے عام ملکی نظام کتاب و سنت کی اس تعبیر پر مبنی ہوگا جسے اکثریت مانتی ہو اور اکثریت کتاب و سنت سے مراد خلافتِ راشدہ کا نظام سمجھتی ہے جس میں شیعہ شریک نہیں اس اصول کے تحت وہی شخص صدر مملکت ہو سکتا ہے جو خلافتِ راشدہ کا قائل ہو۔

انہوں نے کہا کہ مولانا شاید بھول گئے ہیں کہ پاکستان کے حصول کے لئے جدوجہد میں شیعہ فرقے کے مسلمان برابر

کے شریک ہے ہیں اور انہوں نے یہ ملک اس لئے نہیں بنایا تھا کہ ان کا "پرسنل لاء" محفوظ ہوگا۔ "پرسنل لاء" تو پاکستان میں غیر مسلم اقلیت کے بھی محفوظ ہونگے۔ انہوں نے کہا کہ مولانا مودودی نے اپنے بیان کے جواز میں مراکش، ایران انڈونیشیا اور ملایا کی مثالیں دی ہیں۔ لیکن موصوف کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ان کا معاملہ پاکستان سے بالکل مختلف ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر مولانا مودودی لبنان کی مثال دیتے تو شاید قابلِ غور سمجھی جاتی۔ وہاں عیسائی اور شیعہ اور سنی مسلمانوں نے مل کر فرانسیسیوں سے اقتدار چھینا اور ایک ملک بنایا اور اس کے آئین میں اکثریتی فرقہ کا صدر، سنی وزیر اعظم اور شیعہ سپیکر کا انتخاب ضروری قرار دیا گیا۔ اسی طرح ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی متحدہ جدوجہد سے انگریز سے اقتدار چھینا اور پاکستان بنایا۔ لہٰذا اس نسبت سے اقتدار میں بھی شیعہ فرقہ کا عمل دخل ہونا چاہیئے۔

انہوں نے کہا کہ مولانا مودودی جو اسلام کی نمائندگی کے دعویدار ہیں وہ اس سے بھی باخبر ہیں کہ شیعہ مسلمان اسلامی فرقہ ہے اور سوادِ اعظم کے دوش بدوش پاکستان کے لئے ان کی قربانیاں کسی سے کم نہیں۔ لہٰذا جو بھی نظام یہاں پر رائج ہوگا، شیعوں کو اس میں مذہبی ملکی اور شخصی تحفظ دینا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ فقہی مسائل اور عبادات کا تحفظ تو غیر مسلموں کو بھی حاصل ہے۔ لہٰذا مولانا مودودی شیعوں کو سوادِ اعظم کی سطح پر رکھیں نہ کہ ہندوؤں، سکھوں، اچھوتوں اور عیسائیوں جیسے غیر مسلم اقلیتوں کے برابر سمجھیں۔"

(بحوالہ روزنامہ "مساوات" مورخہ ۱۹ اگست ۱۹۷۰ء)

اور اسی ادارہ کے ایک اجلاس میں حسب ذیل قرارداد بھی منظور کی گئی۔

"شیعانِ پاکستان کسی ایسے پرسنل یا پبلک لاء کو تسلیم نہیں کرینگے جس میں اہل تشیع کے سیاسی، مذہبی اور معاشرتی حقوق کے تحفظ کی مکمل ضمانت نہ دی گئی ہو۔ اس عزم کا اظہار آج ادارہ تحفظِ حقوقِ شیعہ پاکستان کے اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے کیا گیا۔ یہ اجلاس آج بلغ بیرون موچی دروازہ میں مولانا سید اظہر حسین زیدی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ایک اور قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ اسمبلیوں کے انتخابات کے طریق کار میں ترمیم کر کے ایسے قانون کو نافذ کیا جائے جس میں شیعہ فرقہ کو اسمبلیوں میں مناسب نمائندگی دی جائے۔ ان قراردادوں کی تائید میں سید مظفر علی شمسی، مولانا سید محبوب علی شاہ، مولانا ظفر الحسن، مولانا خادم حسین بخاری، ڈاکٹر سید ریاض حسین اور ڈاکٹر سید خادم حسین نے بھی تقاریر کیں۔

پاکستان شیعہ پولیٹیکل پارٹی کی کنونشن کمیٹی کے رکن جناب غلام ربانی مرزا نے صدر مملکت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ مسلمانوں میں گروہی انتشار پیدا کرنے والوں کے خلاف موثر اقدام کریں۔ ایک اخباری بیان میں انہوں نے کہا کہ قائداعظم نے قیام پاکستان سے قبل اور بعد متعدد بار اس امر کا اعلان کیا کہ پاکستان میں ایک ایسی فلاحی

مملکت کا قیام عمل میں لایا جائے گا جس میں ہر قسم کے جبر و استحصال کا خاتمہ کیا جائے گا اور ہر فرد کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ لیکن وہ عناصر جو آخری وقت تک پاکستان کی مخالفت کرتے رہے۔ آج نہ صرف نظریۂ پاکستان کے خالق و محافظ بن گئے ہیں بلکہ وہ قرآن و سنت کی سنّی تعبیر پر پاکستان کے دستور کی تدوین کرنا چاہتے ہیں۔"

(بحوالہ روزنامہ "مساوات" مورخہ ۲۹/۷۰)

اس کے جواب میں مودودی صاحب نے حسب ذیل بیان شائع فرمایا۔

مودودی صاحب کا جواب

"میرے محترم دوست مولانا سید اظہر حسین زیدی صاحب کا جو بیان اخبارات میں شائع ہوا ہے اُسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے میرے اُس بیان کو شیعہ حضرات کے لئے دل آزار قرار دیا ہے جو میں نے ادارۂ تحفظ حقوق شیعہ کی طرف سے اٹھائے ہوئے سوالات کے جواب میں دیا تھا۔ اور اس کے متعلق بعض ایسی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ جنہیں میں غلط فہمی پر ہی مبنی قرار دے سکتا ہوں۔ میں نے ان کے ادارے کے ارسال کردہ خط کا جواب براہ راست ان کے ادارہ ہی کو دیا تھا اور اسے اخبارات میں اشاعت کے لئے مجبوراً اس لئے بھیجا تھا کہ برادرم سید مظفر علی شمسی صاحب نے وہی سوالات اپنی ایک پریس کانفرنس میں چھیڑ دیئے تھے۔ اب میں ان کی غلط فہمی کو رفع کرنے کے لئے چند امور کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

صدرِ مملکت کے بارے میں یہ بات میں نے اپنے بیان میں واضح طور پر کہی تھی کہ ہمارے نزدیک اس کا صرف مسلمان ہونا کافی ہے خواہ وہ مسلمہ اسلامی فرقوں میں سے کسی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔ اس سے قادیانی تو بے شک خارج ہو جاتے ہیں مگر جہاں تک شیعوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں نہ صرف یہ کہ ان کا ایک اسلامی فرقہ ہونا مسلم ہے بلکہ مسلمانوں میں اب تک یہ سوال کبھی پیدا ہی نہیں ہوا کہ صدر مملکت کا تعلق کس فرقے سے ہے۔ قائداعظمؒ کو سب نے اپنا قائد مانا اور کسی نے یہ سوچا تک نہیں کہ وہ سنّی ہیں یا شیعہ۔ سکندر مرزا ایک مدت تک صدر مملکت رہے۔ ان کے سیاسی کاموں پر تو ہر طرح کے اعتراضات کئے گئے مگر کبھی کسی شخص نے اس بنا پر اعتراض نہیں کیا کہ وہ شیعہ تھے۔ موجودہ صدر بھی شیعہ ہیں۔ کیا کبھی ان کے مذہبی مسلک کی بنا پر کسی نے ان کی صدارت پر اعتراض کیا ہے؟ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقت یہ سوال چھیڑنے کا کیا خاص فائدہ سوچا گیا ہے۔

پبلک لاء کے بارے میں جو بات میں نے کہی ہے میرے شیعہ بھائیوں کو ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنا چاہیئے۔ اگر اس ملک میں آمریت یا بادشاہی نہیں چلنی ہے بلکہ ہمیں جمہوری طریقے پر ہی ملک کا نظام چلانا ہے تو ملک کی پارلیمنٹ یا اسمبلی میں جو قانون سازی بھی ہوگی وہ بہرحال اکثریت کی رائے سے ہی ہوگی۔ پاکستان میں اکثریت سنّیوں کی ہے اس لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہے کہ قرآن و سنت کی وہی تعبیر پبلک لاء کی بنیاد بنے جسے سنّی

اکثریت مانتی ہے۔ یہ اصول اگر شیعہ بھائیوں کو قبول نہیں ہے تو ان کے لئے دو راستوں میں سے ایک ہی راستہ باقی رہ جاتا ہے جسے وہ اختیار کر سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کہیں کہ پبلک لا شیعہ اقلیت کی تعبیر کے مطابق بننا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ وہ کہیں کہ قرآن و سنت کو یہاں سرے سے ماخذ قانون قرار ہی نہیں دینا چاہیئے کیونکہ پبلک لا کے معاملہ میں قرآن و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو تمام اسلامی فرقوں کے نزدیک مسلّم ہو۔ کیا ہمارے شیعہ بھائی ان دو راستوں میں سے کسی ایک کو اختیار کریں گے، یا کوئی تیسرا راستہ بھی ہے جسے وہ تجویز کر سکتے ہوں؟ اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ شیعہ بھائیوں نے پاکستان کے قیام میں برابر کا حصہ لیا ہے اور ان کے حقوق یہاں کسی سے کم نہیں ہیں جہاں تک انتظامیہ اور عدلیہ کا تعلق ہے، اس میں کسی فرقہ وارانہ امتیاز کا سوال نہ یہاں کبھی پیدا ہوا ہے نہ ہوگا۔ لیکن حکومت کے شعبہ قانون سازی کے معاملہ میں یہ ایک عملی دشواری ہے کہ پبلک لا کی حد تک قانون سازی بہرحال کتاب و سنت کی کسی ایک ہی تعبیر پر ہو سکتی ہے۔ اس عملی دشواری کا کوئی منصفانہ حل اگر اس کے سوا پیش کیا جا سکتا ہو جو میں نے بیان کیا ہے تو اسے ضرور پیش کیا جائے۔ اس پر ضرور کھلے دل سے غور کیا جائے گا۔ مولانا زیدی صاحب نے علماء کے جن متفقہ بائیس اصولوں کا حوالہ دیا ہے ان کو وہ پھر اٹھا کر دیکھ لیں۔ ان میں صرف پرسنل لا کی حد تک سنی و شیعہ علماء کے درمیان یہ طے ہوا تھا کہ ہر فرقے کے لئے قرآن و سنت کی وہی تعبیر معتبر ہوگی جسے وہ فرقہ مانتا ہو۔ پبلک لا کے بارے میں اگر کوئی ایک لفظ بھی ان بائیس اصولوں میں سے میرے بیان سے مختلف پایا جاتا ہو تو وہ براہ کرم اس کا حوالہ دے دیں۔" (بحوالہ ایشیا۔ بابت ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

شیعہ حضرات کی طرف سے اس کا کیا جواب دیا گیا، وہ ان سطور کی تسوید تک ہماری نظروں سے نہیں گزرا لیکن اصولاً ایک بات واضح ہے اور وہ یہ کہ مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ پاکستان میں قانونِ شریعت بہرحال اصولِ جمہوریت کی رُو سے، اکثریت کے مسلک کے مطابق نافذ ہوگا۔ لیکن شیعہ حضرات تو بنیادی طور پر جمہوریت، شوریٰ، انتخاب، وغیرہ کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اگر وہ ایسا تسلیم کر لیں تو سنیوں اور شیعوں کے درمیان بنیادی مابہ النزاع مسئلہ (خلافت) ایک منٹ میں طے ہو جائے۔ ان کے نزدیک، خلافت کا حق صرف امامِ معصوم کو حاصل ہے جو مامور من اللہ ہوتا ہے، نہ کہ لوگوں کا منتخب کردہ۔ اور اس امام (یا ائمہ معصومین) کا ارشاد فرمودہ قانون ہی قانونِ شریعت کہلا سکتا ہے۔ شیعہ حضرات تو ایک طرف رہے، یہ اصول تو مسلمانوں کے کسی فرقے کے نزدیک بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا کہ جس بات کو ملک کی اکثریت حق و صداقت کہے اسے حق و صداقت تسلیم کر لیا جائے۔ شیعہ حضرات منتخب شدہ صدر کو بھی شرعی سربراہ مملکت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے خواہ وہ کیسا ہی متقی اور پرہیزگار کیوں نہ ہو۔ (مثلاً) واقعہ کربلا کے سلسلہ میں سنی اور شیعہ باہم گرمتفق نظر آتے ہیں لیکن جہاں تک اس واقعہ کی علت کا تعلق

ہے، دونوں میں بنیادی اختلاف ہے۔ سنّیوں کے نزدیک یزید اسلئے سزاوارِ خلافت نہیں تھا کہ وہ فاسق و فاجر تھا۔ ..... لیکن شیعہ حضرات کے نزدیک، یزید کے مستحقِ خلافت نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں تھی۔ اس کی وجہ سرکودھا سے شائع ہونے والے ہفت روزہ "المفید" نے (جس کے ایڈیٹر سیّد بشیر حسین بخاری تھے) اپنی اشاعت بابت ۱/۸ جولائی ۱۹۶۰ء میں یہ بتائی تھی کہ

> یہ کہنا کہ چونکہ یزید فاسق و فاجر تھا اس لئے سیدنا امام حسینؓ نے اس کی بیعت نہیں کی، سراسر غلط ہے اور بے بنیاد ہے۔ اگر یزید تقوے کے بلند ترین مقام کا بھی حامل ہوتا تو فرزندِ رسولؐ پھر بھی اس کی بیعت نہ کرتے کیونکہ معصوم کسی غیر معصوم کی بیعت نہیں کرتا۔ امام کسی غیر امام کی بیعت نہیں کرتا۔ حسین علیہ السلام کی عصمت و امامت پر قرآن شاہد ہے۔
>
> (بحوالہ ہفت روزہ تنظیم اہلحدیث۔ بابت ۲۹ جولائی ۱۹۶۰ء)

لہٰذا شیعہ حضرات کے نزدیک، اکثریت، جمہوریت وغیرہ قسم کے دلائل کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتے۔ بایں ہمہ مودودی صاحب نے اپنے بیان میں جو سوال اٹھایا ہے وہ بڑا اہم ہے۔ یعنی یہ کہ پاکستان میں پبلک لاء کس طرح مدوّن کئے جائیں جو سنّی اور شیعہ دونوں کے نزدیک اسلامی ہوں؟ اور اگر ایسے قوانین کا مرتب ہونا ممکن نہیں تو پھر یہاں کس قسم کے قوانین نافذ کئے جائیں۔

یہی سوال "طلوع اسلام" تئیس سال سے خود مودودی صاحب سے کرتا چلا آرہا تھا۔

قبل اس کے کہ ہم مودودی صاحب کے بیان کے ایک اہم گوشے کو سامنے لائیں، ہم یہاں ان سے ایک وضاحت چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ پاکستان میں قانونِ شریعت وہی رائج ہوگا جسے پارلیمان کی اکثریت منظور کریگی اور چونکہ یہاں کی آبادی میں سنّیوں کی اکثریت ہے اس لئے یہاں سنّیوں کا قانونِ شریعت رائج ہوگا۔ جمہوریت کا یہی تقاضا ہے۔

یہ منطق ہی غلط ہے کہ چونکہ یہاں سنّیوں کی اکثریت ہے اس لئے پارلیمان میں بھی بالضرور سنّیوں کی اکثریت ہوگی۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ملک میں سنّیوں کی اکثریت کے باوجود پارلیمان میں اکثریت غیر سنّیوں کی ہو جائے۔ آبادی کے لحاظ سے پارلیمان میں سنّیوں کی اکثریت اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ پارلیمان میں ہر فرقے کے لئے ان کی آبادی کے تناسب سے الگ الگ نشستیں مخصوص ہوں۔ اس وقت تک تو یہاں یہ صورت نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پارلیمان میں (مثلاً) شیعوں کی اکثریت ہو جائے تو کیا سنّی حضرات، ان کے منظور اور رائج کردہ قوانینِ شریعت کو اسلامی قوانین تسلیم کر لینگے؟ کیا خود مودودی صاحب انہیں ایسا تسلیم کر کے ان کی اطاعت اختیار کر لینگے؟ اور اگر پارلیمان میں "اسلامی سوشلسٹوں" کی اکثریت ہو جائے،

اور وہ کتاب و سنت کی اپنی تعبیر کے مطابق اسلامی قوانین رائج کرنا چاہیں، تو کیا مودودی صاحب انہیں اسلامی قوانین تسلیم کر لیں گے؟ (واضح رہے کہ مسٹر بھٹو نے بھی اعلان کیا ہے کہ اگر وہ برسرِ اقتدار آگئے تو ملک کا کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں بنے گا)۔ جمہوریت کا تقاضا تو بہرحال یہی ہوگا کہ انہیں اسلامی قوانین تصور کیا جائے۔ کیا فرماتے ہیں مودودی صاحب اس باب میں!

(۰)

اب آگے بڑھیے۔

پھر مغالطہ آفرینی

مودودی صاحب نے اپنے بیان میں پھر ایک مغالطہ دیا ہے (ان کی ٹیکنیک ہی مغالطہ آفرینی ہے)۔ انہوں نے کہا ہے کہ چونکہ پاکستان میں اکثریت سنیوں کی ہے اس لئے کتاب و سنت کی وہی تعبیر پبلک لاء کی بنیاد بنے گی جسے سنی اکثریت مانتی ہے۔ اس سے مودودی صاحب نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اگر شیعوں کو الگ کر دیا جائے تو اس کے بعد یہاں صرف ایک گروہ باقی رہ جاتا ہے جسے سنی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا، پبلک لاء سنیوں کی صوابدید کے مطابق مرتب ہوگا۔

ایسا کہنا کھلا ہوا فریب ہے۔ سنی کسی ایک فرقہ کا نام نہیں۔ ان میں بھی بہت سے فرقے شامل ہیں جن میں باہمی بے حد اختلاف ہے۔ ان میں دو بنیادی فرقے ہیں — اہل حدیث اور اہل فقہ ہیں — چونکہ پاکستان میں اہل فقہ، حنفی ہیں، اس لئے یوں کہیے کہ سنیوں میں دو بڑے گروہ، اہل حدیث اور حنفی ہیں۔ اگرچہ اہل حدیث میں بھی باہمی اختلافات ہیں اور حنفیوں میں بھی۔ لیکن چونکہ مودودی صاحب کا کہنا یہ ہے کہ اگر یہاں حنفی فقہ رائج کر دی جائے تو وہ "سنیوں" کے نزدیک قابلِ قبول ہوگی، اس لئے ہم ان کی اس فریب دہی کو بھی بے نقاب کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ پبلک لاز کے متعلق حنفیوں اور اہلحدیث میں کس قدر شدید اختلاف ہے، اس کے متعلق طلوع اسلام نے اپنی مارچ ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں ایک مقالہ شائع کیا تھا جس کا عنوان تھا — ان سے اسلامی قوانین بنوائیے۔ — موضوع زیرِ نظر کی وضاحت کے پیشِ نظر ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس مقالہ کو ایک بار پھر قارئین کے سامنے لایا جائے۔ اسے ملاحظہ فرمائیے۔

اِن سے اسلامی قوانین بنوائیے!

(غیر منقسم) ہندوستان کے مسلمانوں نے ایک خطۂ زمین کا مطالبہ کیا جس میں وہ اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ وہ خطۂ زمین مل گیا۔ اس بات کو سترہ برس سے اوپر ہو گئے لیکن اس ملک میں اسلامی قوانین کا مرتب کرنا یا نافذ ہونا تو ایک طرف، ابھی تک یہی طے نہیں ہونے پایا کہ اسلامی قوانین کہتے کسے

ہیں اور ان کے مرتب کرنے کا اصول کیا ہے۔ بات مذہبی پیشواؤں کے ہتھے چڑھ گئی ہے اور جو بات ان کے ہتھے چڑھ جائے، اس کا حشر کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق حکیم الامت نے مدت ہوئی کہہ دیا تھا کہ

میں جانتا ہوں انجام اس کا   جس معرکے کے ملا ہوں غازی

یہی وہ حقیقت ہے جس کے متعلق ہم سترہ برس سے مسلسل و متواتر کہتے چلے آ رہے ہیں کہ اگر معاملہ مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ ہی میں رہا تو اسلامی قوانین قیامت تک مرتب نہیں ہو سکیں گے۔ جو لوگ تیرہ سو برس میں بھی اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ نماز میں ہاتھ کہاں باندھنے چاہئیں کیا وہ ایک اسلامی مملکت کے لئے ایسے قوانین مرتب کر سکیں گے جو تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر نافذ ہو سکیں؟ یا یوں کہئے کہ کیا یہ لوگ ایسا ضابطہ قوانین مرتب کر سکیں گے جو ان سب کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی کہلا سکے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی تازہ مثال ملاحظہ فرمایئے۔

پاکستان میں ایک فرقہ حنفی کہلاتا ہے (اگرچہ ان میں بھی باہمی اختلافات ہیں۔ دیوبندی اور بریلوی دونوں حنفی کہلاتے ہیں اور ان دونوں میں جو آئے دن سر پھٹول ہوتی رہتی ہے، اس سے آپ واقف ہیں) دوسرا فرقہ اہلحدیث کا ہے، (یہ اہلِ سنت والجماعت کے فرقے ہیں۔ شیعہ فرقہ ان سے الگ ہے) حنفیوں کی یہاں اکثریت بتائی جاتی ہے۔ اس لئے ان کا مطالبہ یہ ہے کہ ملک میں فقہ حنفی رائج کر دی جائے۔ یہ تجویز مودودی صاحب نے بھی پیش کی تھی —— اگرچہ وہ فقہ کو "مجددشاستر" سے تعبیر کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہی تجویز اب مولانا محمد یوسف صاحب بنوری نے پیش کی ہے۔ دوسری طرف اہلِ حدیث ہیں اور ان کا ترجمان 'لاہور سے شائع ہونے والا جریدہ الاعتصام ہے۔ اب دیکھئے کہ ان دونوں میں، اس سوال پر کس قدر کشمکش ہو رہی ہے۔ الاعتصام میں ایک سلسلہ مضامین شائع ہوتا ہے جس کا عنوان ہے —— کیا فقہ حنفی اسلام کی کامل اور صحیح تعبیر ہے؟ —— اس سلسلہ میں الاعتصام کی ۱۵ دسمبر ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں جو کڑی شائع ہوئی ہے اسے ملاحظہ فرمایئے۔ اس میں لکھا ہے۔

الاعتصام کا مضمون

"نیو ٹاؤن۔ کراچی کے مدرسہ عربیہ کا ایک ماہوار مجلہ ہے، نام "بینات"۔ یہ رسالہ اور مدرسہ گو فقہ العراق کے ترجمان ہیں لیکن اس کے نگران حضرت مولانا محمد یوسف بنوری علمی حلقوں میں بڑی عزت سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی نظر فقہ اور حدیث دونوں پر ہے۔ ان کے متعلق ہماری رائے یہ تھی کہ وہ اپنے مسلک کی حمایت کے ساتھ اسلام کی عمومی اقدار کا بھی خیال رکھیں گے اور دوسرے مسالک کے ساتھ بھی وہ انصاف کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ لیکن "بینات" شمارہ ۱۲ جلد ۳ کا اداریہ دیکھ کر ہماری حیرت کی حد نہ رہی۔ قارئین کرام بھی یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ اتنے اونچے لوگ بھی اس قدر نیچے آ سکتے ہیں اور ایسی سطح کی بات کہہ سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

اس وقت دنیائے اسلام میں ہماری ہی مملکت وہ مملکت ہے جو اسلام کے نام پر بنی اور اسلامی حکومت کے قیام کے عزم سے قائم ہوئی ہے۔ اس لئے اس کو اسلامی قالب عطا کرنے کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہم ہی پر عاید ہوتی ہے اور سچ یہ ہے کہ اگر عزم صمیم ہو تو یہ کام ایسا دشوار بھی نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے ملک کی اکثریت بلکہ بڑی غالب اکثریت فقہ حنفی کی پیرو ہے اور جمہوری اصول کے ماتحت جب بھی اسلامی حکومت قائم ہو، اسی فقہ کی ترویج ضروری ہوگی۔ اور یہ وہ فقہ ہے جو نہایت منظم، مدوّن، محفوظ، اور ہر عملی پہلو کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور اس پر صدیوں تک عظیم الشان حکومتیں کامیابی سے چل چکی ہیں۔ اس لئے ہم کو فوری طور پر قانون سازی میں زیادہ وقت لگانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ان قوانین کا نفاذ ہمارا پہلا قدم ہونا چاہیئے۔

بلاشبہ موجودہ معیشت کے پیدا کردہ مسائل کا حل ہمارے قدیم فقہ میں نہیں ملتا۔ اور ان مسائل کو حل کئے بغیر پوری توانائی سے آگے بڑھا بھی نہیں جاسکتا۔ لیکن یہ کام مدونہ قانون اسلامی کی تنفید کے ساتھ زیادہ آسانی اور مستعدی سے انجام پاسکتا ہے۔ کیونکہ جب ایک بار فقہ حنفی کی سرکاری حیثیت مسلّم ہو جائے گی، تو لازمی طور پر ان نئے مسائل کا حل اسی روشنی میں تلاش کرنا ہوگا تاکہ اہل ملک کے لئے قابل تسلیم ہو۔ اور اس کام کے اہل صرف وہی علماء ہوسکیں گے جو فقہ حنفی کے ماہر ہوں اور جن کے علم و تقویٰ، اجتہاد اور دیانت پر مسلمانوں کو اعتماد ہو۔ اس طرح موجودہ تحقیقاتی رسّہ کشی بھی ختم ہو جائے گی۔ مکیگل اور شکاگو کے تعلیم یافتہ یا قیادت اور صحافت کی راہ سے بنتے ہوئے محققین خود بخود میدان چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

ہم نے یہ ارشاد بار بار پڑھا، اور ہمیں افسوس ہوا۔ اس لئے کہ حضرت مولانا بنوری کی نگرانی میں ملکی اور ملّی ضرورت کے متعلق جو کچھ لکھا جائے اس کا معیار اس سے بہت اونچا اور انداز اس سے بہت وسیع ہونا چاہیئے۔ اس کے متعلق تنقیدی گزارش سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آسانی کے لئے اس کا اختصار اور تجزیہ کر لیا جائے۔ اس تجزیہ کے جس حصہ کا انکار فرمایا جائے، ہمیں اس پر اصرار نہیں ہوگا۔

(۱) یہ ملک اسلامی ہے۔ اس لئے حکومت کا فرض ہے کہ اس کے نظام کو اسلامی قالب عطا کرے۔

(۲) اور یہ کام اس لئے مشکل نہیں کہ اس ملک کی اکثریت فقہ حنفی کو مانتی ہے۔

(۳) جمہوری اصولوں کے مطابق اس ملک میں فقہ حنفی کی ترویج ضروری ہے۔

(۴) فقہ حنفی کے سہارے پر بڑی حکومتیں چلتی رہیں۔

(۵) معیشت کے نئے مسائل واقعی فقہ حنفی میں نہیں اور ان کے حل کے سوا چارہ بھی نہیں۔

(۶) فقہ حنفی کو اگر سرکاری حیثیت مل جائے تو اسلامی قانون کے نفاذ میں آسانی ہوگی۔

(۷) نئے مسائل کا حل فقہ حنفی کی روشنی میں ہونا چاہیئے۔

(۸) ان مسائل کے حل کے لئے صرف فقہ حنفی کے ماہرین سے کام لینا چاہیئے۔

یہ بالکل درست ہے۔ یہ ملک اسلامی ہے اور اس میں قوانین کو اسلامی قالب دینا چاہیئے۔ مطالبہ ۲ کے بعد ۳ بالکل بے جوڑ ہے۔ جب ائمہ اربعہ اور ان کی فقہ اور صحابہ اور تمام ائمہ سلف مسلمان ہیں اور وہ سب اسلام کی ترجمانی فرماتے ہیں۔ تو ۔۔ پھر اسلام کو سکیڑ کر صرف فقہ حنفی کے قالب میں کیوں بند کر دیا جائے فقہ حنفی صرف ایک مکتب فکر ہے جس میں علماء عراق کے خیالات اور اہل کوفہ کے تصورات کی ترجمانی کی گئی۔

۱۹۵۲ء میں دستور کے متعلق جو میٹنگ ۳۱ علماء کی کراچی میں ہوئی تھی۔ اس میں دستوری سطح پر یہ فیصلہ ہوا تھا کہ تمام مکاتب فکر کو اپنے اپنے نقطۂ نظر کی پابندی کے لئے کھلی اجازت ہوگی حتیٰ کہ سنت کا مفہوم وہی معتبر ہوگا جو اس مکتب فکر کے ارباب حل وعقد کے نزدیک مسلم ہوگا۔ دستور میں اس قدر توسیع اور گنجائش اور قوانین میں یہ تنگ دلی بے جوڑ سی بات ہوگی۔

جب ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے تو اس میں پورے اسلام کو برسر اقتدار رہنا ہے کسی مکتب فکر کو بھی خارج البلد نہیں ہونا چاہیئے۔ اختلاف کی صورت میں قضاۃ اور قانونی عدالتوں کو مخصوص اختیارات دیئے جانے چاہئیں۔ جنہیں وہ استعمال کریں اور مختلف مکاتب فکر کے لوگوں میں فیصل خصومات کر سکیں یا مخصوص حالات میں کسی مکتب فکر کو ترجیح دے سکیں۔ لیکن ملک پر کسی مکتب فکر اور اس کی فقہیات کو مسلط نہیں کرنا چاہیئے۔

۔۔ اگر واقعی اس ملک میں احناف کی اکثریت ہے تو خیر احناف کی اس سے نہ اہمیت کم ہوتی ہے جب کہ ان کو اہمیت حاصل ہے اور نہ ان کی مشکلات کو نظر انداز ہی کیا جا سکتا ہے۔

(۳) دین کے معاملات میں مروجہ جمہوری اصولوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ ائمہ کی فقہیات کا تعلق دین سے ہے۔ دینی امور کا فیصلہ کبھی مروجہ جمہوری اصولوں کے ماتحت نہیں کیا گیا۔ اگر کوئی سیاسی مسئلہ ہوتا یا کسی دنیوی نزاع کا رفع کرنا پیش نظر ہوتا تو غیر جمہوری اصول زیر بحث آ سکتے تھے۔ لیکن ۔۔ نکاح، طلاق، نماز، وغیرہ ۔۔ معاملات میں جب شریعت کے مطابق فیصلہ کرنا ہو تو کسی شخص کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ اپنے ضمیر کے خلاف یہ فیصلہ اس لئے قبول کر لے کہ یہ اکثریت کا خیال ہے۔ فقہ حنفی کو قانونی حیثیت تو بڑی بات ہے اس مطالبہ کا خیال بھی نہیں آنا چاہیئے۔

اکثریت کہاں

آپ فرماتے ہیں، اس ملک میں احناف کی اکثریت ہے۔ میں یہ گزارش کروں گا۔ آپ مختلف طبقات اور ان کے مذہبی خیالات پہ نگاہ ڈالیں۔ کیا بریلوی حضرات آپ کے نزدیک یقیناً حنفی ہیں؟ کیا ملک کا عام تعلیم یافتہ طبقہ جس کو ملک کا دماغ کہنا چاہیئے، وہ بھی اکثر ان معنوی پابندیوں سے آزاد نہیں؟ اور آزاد رہنا نہیں چاہتا؟

اگر آپ بوقتِ ضرورت بریلوی کو اپنا رفیق تصور فرمالیں تو بھی تقلید کے پابند حضرات کچھ زیادہ نہیں ہوں گے۔ ویسے مذہب کے معاملہ میں ایسا تساہل آپ حضرات کے لئے مناسب بھی نہیں ہوگا۔ اکثریت کے شوق میں حنفیت کو بھی خطرے میں نہ ڈال دیں۔ پھر یہ اکثریت کی پناہ دین میں واقعی اگر اصول کا مقام رکھتی ہو تو کیا فقہ کے مسائل کی چھان پھٹک بھی اس اصل کے ماتحت ہو سکتی ہے؟ کیا جن مسائل میں حضرت امام ابو حنیفہؒ جمہور کے خلاف ہوں، وہاں حضرت امامؒ کا مسلک ترک کر دیا جائے اور جمہور کے مسلک کو ترجیح دیجائے؟ جہاں ائمہ ثلاثہ حضرت امام کے خلاف ہوں، وہ بھی ترک کر دیئے جائیں اور جہاں حضرت امام کے تلامذہ حضرت امام سے اختلاف فرمائیں انہیں خیرباد کہہ دیا جائے۔

پھر اس چیز پر بھی غور فرمائیں۔ آیا آپ کی نظر میں متعارف اصطلاح کے مطابق یہ ملک جمہوری ہے؟ یہ تو درست ہو سکتا ہے کہ چونکہ حکومت نے شہروں، دیہاتوں اور قصبات میں کچھ کمیٹیاں بنائی ہیں، انہیں جمہوریتوں کا بھی کہیں کہیں نام دیا جاتا ہے۔ جناب نے اس اصطلاح کے مطابق جمہوری ملک کہہ دیں تو ہو سکتا ہے لیکن اصل جمہوریت کے لئے تو لوگ جیلوں کی زیارت پر مجبور ہیں۔ اس وقت ساری جمہوریت لپیٹ کر کنونشن مسلم لیگ کے بیٹ میں رکھ دی گئی ہے۔ یہ جمہوری اصولوں کی بات جناب کس انداز میں فرما رہے ہیں؟

فقہ حنفی اور حکومتیں

مولانا! پچھلی تاریخ پر غور فرمائیں۔ آیا واقعی جو بڑی بڑی حکومتیں مذہباً حنفی تھیں، وہ فقہ حنفی پر چلتی بھی رہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ حکومتیں اپنے مادی اسباب، اور قوت کے سہارے چلتی رہی ہیں۔ یعنی چلنے کی اصل وجہ قوت تھی ــــ فقہ نہ تھی۔ بلکہ ایسے واقعات آپ کو تاریخ میں ملیں گے کہ جب کوئی فقہ یا کوئی فقیہہ حکومت کی خواہشات کی راہ میں حائل ہوا تو اُسے زورِ بازو سے ہٹا دیا گیا۔

چنانچہ دیکھئے کہ اس وقت بھی حکومت "حنفی" ہی ہے۔ آپ صدر ایوب صاحب سے دریافت فرمائیں، ان کے وزراء سے پوچھیں۔ وہ فرمائیں گے، ہم حنفی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ مطالبہ فرما رہے ہیں کہ اس ملک میں فقہ حنفی کو قانونی حیثیت دی جائے ــــ بادشاہ کا حنفی ہونا اور بات ہے اور ملک کا قانون قرار پانا دوسری بات ہے۔

پھر کسی فقہ کے سہارے پر کسی حکومت کا چلنا، اس کی صداقت یا صحت کا ثبوت نہیں۔ پورے یورپ میں "لادینی فقیہوں" کے سہارے پر بڑی بڑی بادشاہتیں چل رہی ہیں۔ رومن فقہ اور کمیونزم کی فقہ دونوں دو بڑے عظیم الشان ملکوں کے قانون کی اساس ہیں۔ ان ملکوں میں مادی قوتوں کا یہ حال ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کو بھی مجبور کرتے ہیں کہ وہ ان "فقیہوں" کے تقاضوں کو قبول کریں ـــ یہ کوئی دلیل نہیں۔ کوئی فقہ ہو جس کی سرپرستی حکومت کرے وہ نظام اسی سرپرستی کے سہارے پر چلے گا۔ یہ فقہ کی خوبی نہیں، سرپرست کی خوبی کہی جا سکتی ہے۔

پھر یہ فقہ حنفی پر کیا موقوف ہے، ائمہ اربعہ کی فقہوں کے اعتماد پر کئی حکومتیں چلتی رہیں۔ حجاز، مصر، یمن، خراسان، وغیرہ ممالک میں شافعی حکومت رہی ـــ الجزائر، بربر اور مغرب کے کئی ممالک میں سلفی الخیال حکومت کرتے رہے۔ اندلس پر مالکی اسی طرح حکومت کرتے رہے جس طرح کئی سال ہندوستان اور افغانستان پر حنفی حکومت کرتے رہے۔ ایران پر مدت سے روافض حکومت کر رہے ہیں ـــ یہ حق کے لئے کہاں تک دلیل ہو سکتی ہے! ـــ یہ معلوم نہیں کہ جن ممالک پر حنفی فقہ کے تعاون سے حکومت ہوتی رہی، ان ممالک میں دوسرے مکاتب فکر کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا گیا۔ جبراً ان پر فقہ حنفی ٹھونسی گئی یا ان کو ان کی صواب دید کے مطابق عمل میں مراعات دی گئیں۔ اور آپ حضرات کی طرح درخواست کر کے فقہ حنفی کو مسلط کیا گیا۔

متوازن مشورہ

ہماری رائے تو یہ ہے کہ اس ملک میں پورے اسلام کو موقع ملنا چاہیئے۔ تمام مکاتب فکر کھلے طور پر اپنی اپنی فقہ پر عمل کریں اور لوگ آزادی سے جس مسئلہ میں چاہیں جس مکتب فکر کو پسند کریں اسے اپنا لیں، اس پر عمل کریں اور کوئی تعصب نہ ہو۔ اس لحاظ سے یہ ملک دنیا کے لئے مثالی ہو کہ اس میں کسی مصیبت کے لئے کوئی جگہ نہ ہو۔ (الاعتصام کا اقتباس ختم ہوا۔ اس کے بعد طلوع اسلام کا تبصرہ ملاحظہ فرمایئے)

طلوع اسلام

آپ نے "بینات" کی تجویز اور اس پر الاعتصام کا تبصرہ ملاحظہ فرما لیا۔ سوال زیر غور یہ تھا کہ ملک میں ایسے قوانین نافذ کئے جائیں جن کا اطلاق تمام مسلمانوں (یعنی مختلف فرقوں کے مسلمانوں) پر یکساں طور پر ہو سکے۔ اور اس سلسلہ میں تجویز یہ کیا جا رہا ہے کہ ہر فرقہ کو اجازت ہو کہ وہ اپنے اپنے مسلک کے مطابق عمل کر لیا کریں!

حنفی حضرات کو تو چھوڑیئے کہ وہ اپنے ائمہ کی مرتب کردہ فقہ کے متبع ہیں۔ ہم الاعتصام سے ـــ جو سنت رسولؐ اللہ کے اتباع کا مدعی ہے ـــ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ

۱۔ کیا رسولؐ اللہ کے زمانے میں بھی اسلامی قوانین کا اتباع اسی طرح ہوتا تھا کہ ہر فرقہ کا مسلمان اپنے اپنے مسلک کے مطابق عمل کرتا تھا؟

(۲) اگر رسول اللہ کے زمانے میں ایسا نہیں ہوتا تھا تو کیا ایسا کرنا خلافِ سنّت (یعنی بدعت) نہیں ہوگا ؟
(۳) کیا رسول اللہ کے زمانے میں بھی مسلمانوں میں مختلف فرقے تھے ؟
(۴) کیا قرآن کریم نے فرقوں کے وجود کو شرک قرار نہیں دیا ؟ (۳۰/۳۲-۳۱)
(۵) کیا نبی اکرمؐ کو خدا نے یہ نہیں کہا تھا کہ جو لوگ دین میں فرقے پیدا کرلیں ان سے تیرا کوئی واسطہ نہیں (۶/۱۶۰)
(۶) کیا مسلمانوں سے خدا نے یہ نہیں کہا تھا کہ تم فرقوں میں نہ بٹ جانا اور باہمی اختلافات نہ کرنے لگ جانا۔ اس لئے کہ جو لوگ ایسا کریں ان پر خدا کا عذاب ہوتا ہے۔ (۳/۱۰۵)
(۷) الاعتصام کی پیشانی پر قرآنِ کریم کی جو آیت درج ہوتی ہے یعنی وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ کیا اس کی عملی تفسیر یہی ہے کہ ہر فرقہ اپنے اپنے مسلک کے مطابق عمل کیا کرے ؟
(۸) کیا آپ کے نزدیک اب کوئی صورت ایسی نہیں جس سے تمام مسلمانوں کے لئے واحد ضابطہ قوانین مرتب ہوسکے۔ اگر اس کا جواب نفی میں ہے (یعنی آپ کے نزدیک اب ایسی صورت پیدا ہی نہیں ہوسکتی) تو کیا اس کا صاف مطلب یہ نہیں کہ اب اس اسلام پر چلنے کی کوئی صورت نہیں رہی جو اسلام نبی اکرمؐ کے زمانے میں رائج تھا ؟

ہم شکر گزار ہونگے اگر ہمارا مؤقر ہمعصر (الاعتصام) ان سوالات کا جواب اپنے ہاں شائع کردے یا ہمیں اشاعت کے لئے بھیج دے۔ ہم اُسے بخوشی شائع کرینگے۔ اس سے بہت سے شکوک رفع ہوجائیں گے اور بہت سی الجھنیں دور۔

(۰)

ان سوالات کا کوئی جواب ہوتا تو الاعتصام شائع کرتا۔ ان کا جواب ان میں سے کسی کے پاس بھی نہیں۔ اور ان کا جواب خود مودودی صاحب کے پاس بھی نہیں جو اقامتِ دین کے اتنے بڑے داعی بنے پھرتے ہیں۔ ان کے پاس جواب ہے تو یہ کہ یہاں چونکہ اکثریت فقہ حنفی کے ماننے والوں کی ہے اسلئے یہاں فقہ حنفی کی کلک لازماً نافذ کرائے جائیں۔ ہم مودودی صاحب سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ (آپ کے اس تصورِ جمہوریت کے مطابق) فقہ حنفی کا جو قانون غیر حنفی مسلمانوں کے نزدیک خلافِ شریعت ہوگا، کیا آپ کی "اسلامی حکومت" اُن سے اُس (خلافِ شریعت) قانون کی اطاعت بزور کرائے گی ؟ اور ایسی صورت میں، اس شخص (یا فرقہ) کو اس کا حق حاصل ہوگا یا نہیں کہ وہ ایسے قوانین کے خلاف علمِ جہاد بلند کرکے حکومت سے بغاوت کرے ؟ آپ اس کا جواب نفی میں نہیں دے سکتے اس لئے کہ آپ لوگوں کو خود ہی مشورہ دے چکے ہیں کہ ایسی صورت میں، لوگوں کو وہی کچھ کرنا چاہیئے جو ان کے نزدیک، مطابق شریعت ہو۔ خواہ ان کا یہ عمل، حکومت کے نافذ کردہ قوانین کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ جب مودودی صاحب نے حکومت کے نافذ کردہ عائلی قوانین کی مخالفت کی تو ان سے ایک صاحب نے پوچھا کہ

اگر ایک شخص قانونِ شریعت کے مطابق اپنی بیوی کو طلاق دے دے لیکن حکومت کا قانون اسے جائز تسلیم نہ کرتا ہو، تو ایسی صورت میں کیا ہوگا؟ اس کا جواب، مودودی صاحب نے یہ دیا تھا کہ

> کسی حکومت کے قوانین سے نہ تو شریعت میں کوئی ترمیم ہو سکتی ہے اور نہ وہ شریعت کے قائمقام بن سکتے ہیں۔ اس لئے جو طلاق شرعی قواعد سے دے دی گئی ہو وہ عنداللہ اور عندالمسلمین نافذ ہو جائے گی خواہ ان قوانین کی رُو سے نافذ نہ ہو۔ اور جو طلاق شرعاً قابلِ نفاذ نہیں ہے وہ ہرگز نافذ نہ ہوگی خواہ یہ قوانین اس کو نافذ کر دیں۔ اب مسلمانوں کو خود سوچ لینا چاہیئے کہ اپنے نکاح و طلاق کے معاملات، خدا اور رسولؐ کی شریعت کے مطابق کرنا چاہتے ہیں یا ان عائلی قوانین کے مطابق۔
>
> (ترجمان القرآن۔ بابت مئی ۱۹۶۲ء)

حکومت کے قوانین اور (لوگوں کے اپنے نزدیک) شرعی قوانین میں تصادم کی جو شکل مودودی صاحب نے اوپر بیان کی ہے، وہی صورت ان تمام پبلک لاز کی صورت میں پیدا ہوگی جنہیں کوئی فرد یا فرقہ، مطابق شریعت تسلیم نہیں کریگا ـــ یعنی حکومت کی طرف سے نافذ کردہ ان حنفی قوانین کی جنہیں غیر حنفی، مطابق شریعت تسلیم نہیں کرینگے۔

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب یہاں، اسلامی نظام اور شرعی قوانین کی آڑ میں، کس قسم کی صورت پیدا کرنا چاہتے ہیں؟

ہم جو کچھ تیئس برس سے کہتے چلے آ رہے ہیں، اسے ایک مرتبہ پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ

> پاکستان (یا کسی اور ملک میں) اسلامی حکومت صرف اس صورت میں قائم ہو سکتی ہے کہ مختلف فرقوں کے مسلمان، اپنے اپنے فرقہ کی فقہ سے صرفِ نظر کر کے قرآنِ خالص کی بنیادوں پر، حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں، ایک جدید فقہ مرتب کریں جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔

یہ صورت ایک دن میں پیدا نہیں ہوگی۔ اس لئے حکومت کا فریضہ ہوگا کہ وہ اس مقام کو بطور منزل اپنے سامنے رکھے اور ملک میں اس قسم کا نظامِ تعلیم رائج کرے جس سے آہستہ آہستہ فرقوں کے امتیازات ختم ہو کر، ہمارے نوجوان صرف مسلمان پیدا ہوں۔

اور اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ایسا ہونا ممکن نہیں تو پھر نہ اپنے آپ کو فریب دیجئے نہ دنیا کو دھوکا۔ دیانتداری سے اس کا اعتراف و اعلان کیجئے کہ ہم اسلامی حکومت قائم نہیں کر سکتے۔ جس حکومت میں کسی ایک فرقہ کے قوانین رائج ہوں، وہ اس فرقہ کی حکومت تو کہلا سکے گی۔ اسلامی حکومت نہیں کہلا سکے گی۔

اس کھلی ہوئی حقیقت کو اگر آپ آج نہیں مانتے تو جس طرح، مودودی صاحب کو ہار تھک کر آج یہ ماننا پڑا ہے کہ کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں ہے جو حنفیوں، شیعوں اور اہلحدیثوں کے درمیان متفق علیہ ہو خواہ اس کا تعلق پرسنل لاء سے ہو یا خواہ پبلک لاء سے، اپنے طور پر زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر انہیں (اور ان کے ساتھ تمام فرقوں کے مسلمانوں کو) یہ بھی ماننا پڑیگا کہ فرقوں کی موجودگی میں اسلامی حکومت قائم نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف قرآن کی بنیادوں پر قائم ہو سکتی ہے۔

باقی رہے مودودی صاحب، تو ان کے پیشِ نظر نہ اسلام ہے، نہ قانونِ شریعت۔ ان کے سامنے ایک ہی مقصد ہے اور وہ یہ کہ یا تو اقتدار ان کے ہاتھ میں دے دیا جائے اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر مسلمانوں میں مسلسل انتشار اور خلفشار پیدا کیا جائے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران، ان کا مطالبہ یہ تھا کہ یہ لوگ، جن میں، ڈھونڈنے سے بھی اسلام کی چھینٹ تک نہیں مل سکے گی، ان کی قیادت چھوڑ کر، مجھے اپنا امیر تسلیم کر دو، ورنہ میں عوام کے دلوں میں ایسے وسوسے پیدا کر دوں گا جن سے وہ اس تحریک کی کشتی ہی کو ڈبو دیں ۔۔۔ اور تشکیلِ پاکستان کے بعد، یہ مطالبہ کہ حکومت میرے حوالے کر دو، ورنہ میں اس مملکت کی اینٹ سے اینٹ بجا دونگا۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے "اسلامی نظام" اور "اسلامی حکومت" کی آڑ میں مسلسل خلفشار پیدا (CHAOS CREATE) کرتے چلے آ رہے ہیں اور اب یہاں اسلامی حکومت کا ایسا نقشہ مرتب کر رہے ہیں جو اسلامی تو بہرحال نہیں ہوگی لیکن اس میں وہ باہمی سر پھٹول اور خانہ جنگی ہوگی جس کے سامنے بغداد کی گلیوں کی خونی داستانیں بھی ماند پڑ جائینگی۔ فقنا ربنا عذاب النار۔

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ ہمارے پاس، سید محمد رضا رضوی، کنوینر ادارہ فلاح ملت (حیدر آباد) کی طرف سے شائع کردہ ایک پمفلٹ آیا جس کا عنوان ہے "آئینِ اسلامی اور مسلمہ اسلامی فرقے"۔ اس میں انہوں نے مودودی صاحب کی اس تجویز کی مخالفت کرنے کے بعد، آخر میں لکھا ہے ۔۔۔ "اگر سوادِ اعظم کے راہنماؤں نے ہماری معروضات کو درخورِ اعتناء نہ سمجھا اور اپنے عمل میں کوئی تبدیلی نہ کی تو ہم اس ملک اور اپنے مستقبل کے بارے میں نئے انداز سے سوچنے پر مجبور ہو جائینگے، خواہ ایک ناگوار فرض کی حیثیت سے سہی"۔ سن لیا آپ نے مودودی صاحب! اور ابھی تو ابتدا ہے۔ اس کے بعد انتظار فرمایئے کہ دوسرے (غیر حنفی) فرقے کیا کہتے ہیں اور حنفی اور غیر حنفی کا کیا ذکر، وہ عوام جو معاشی پروگرام کی دعوت پر پیپلز پارٹی کے ساتھ ہیں، ان کا ردِ عمل اس حنفی فقہ کے خلاف کیا ہوتا ہے جس کا معاشی نظام خالصتہً سرمایہ دارانہ ہے۔ آپ یہاں حنفی (یا کسی فرقہ کی) فقہ نافذ کیجئے اور پھر دیکھئے کہ ملک کا کیا حشر ہوتا ہے۔

لیکن مودودی صاحب تو اس سے بہت خوش ہونگے کہ میں جس مقصد کو لے کر یہاں آیا تھا اس میں کیسے کامیاب ہوا!

(باقی)

قرآن کریم کیخلاف سازش

امیر جماعتِ اسلامی، سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب، جہاں اس امر کے لئے مامور ہیں کہ وہ قوم میں مسلسل انتشار پیدا کرتے رہیں، یہ بات بھی ان کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ اسلام کے خلاف ایسے شبہات ابھارتے رہیں جن سے، نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ آہستہ آہستہ اس سے برگشتہ ہو جائے۔ اس سلسلہ میں حضور نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ، اور صحابہ کبارؓ کی عظمتِ کردار کے خلاف انہوں نے جس قدر وساوس پھیلائے ہیں، ان کا شہرہ اب عام ہو رہا ہے۔ ان کے اسی سلسلہ کے کارناموں کی ایک کڑی اور ہے جو دین کو اس کی اصل و بنیاد سے اکھیڑ دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دین کی اصل و بنیاد یہ حقیقت ہے کہ قرآن کریم جس شکل میں امت کے پاس اس وقت موجود ہے، وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جسے خدا نے بذریعہ وحی رسول اللہ کو عطا فرمایا اور جسے حضورؐ نے امت کو دیا۔ اگر قرآن سے متعلق اس حقیقت میں ذرا سا بھی شبہ لاحق ہو جائے تو نہ دین باقی رہتا ہے نہ ختم نبوت کی حکمت و غایت۔ دین کی اس بنیاد میں تزلزل پیدا کرنے کے لئے، مودودی صاحب نے 'ترجمان القرآن' کی اشاعت بابت جون ۱۹۵۹ء میں (ایک سائل کے جواب میں) ایک مقالہ سپردِ قلم فرمایا تھا جس میں (منجملہ دیگر امور) یہ بھی مذکور تھا کہ

> یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس رسم الخط میں ابتداءً نبی صلعم نے وحی کی کتابت کرائی تھی اور جس میں حضرت ابوبکرؓ نے پہلا مصحف مرتب کرایا اور حضرت عثمانؓ نے جس کی نقل بعد میں شائع کرائی، اس کے اندر نہ صرف یہ کہ اعراب نہ تھے بلکہ نقطے بھی نہ تھے کیونکہ اس وقت تک یہ علامات ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔ اس رسم الخط میں پورے قرآن کی عبارت یوں لکھی گئی تھی۔
>
> كىاٮ احكمٮ اىٮه ڡصلٮ مں لدں حكىم حٮىر

اس طرح قرآن کریم کی کتابت کا نتیجہ کیا تھا، اس کے متعلق انہوں نے تحریر فرمایا تھا۔

> اس طرزِ تحریر کی عبارتوں کو اہلِ زبان اٹکل سے پڑھ لیتے تھے اور بہر حال بامعنی بنا کر

ہی پڑھتے تھے۔ لیکن جہاں مفہوم کے اعتبار سے متشابہ الفاظ آجاتے یا زبان کے قواعد و محاورہ کی رُو سے ایک ہی لفظ کے کئی تلفظ یا اعراب ممکن ہوتے وہاں خود اہلِ زبان کو بھی بکثرت التباسات پیش آجاتے اور یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا کہ لکھنے والے کا منشاء کیا تھا۔

آپ غور فرمائیے کہ اس وسوسہ اندازی کے بعد قرآنِ کریم کی صحت کے متعلق کس قسم کے شکوک و شبہات دلوں میں پیدا نہیں ہو سکتے؟ (وللہ الحمد کہ) طلوعِ اسلام نے اسی زمانہ میں اس کا تعاقب کیا اور اپنی دسمبر ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں (عنوانِ بالا سے) ایک مبسوط مقالہ میں مودودی صاحب کی ان ہفوات کی دھجیاں بکھیر دیں۔ طلوعِ اسلام کی اُسی اشاعت میں علامہ تمنا عمادی کا ایک مفصل تحقیقاتی مقالہ بھی شائع ہوا جس میں انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں (عہدِ جاہلیہ کے ادب سے لیکر بعد کے دور تک کی مثالوں سے) واضح کیا کہ مودودی صاحب اس باب میں کس قدر جاہل واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے ابتداء ہی ایک ایسی مثال سے کی جسے وہ بچہ بھی بآسانی سمجھ جائے جس نے پہلے دن عربی زبان کا قاعدہ پڑھنا شروع کیا ہو۔ انہوں نے لکھا تھا۔

> ہر صاحبِ عقل و ایمان سے میری التجا ہے کہ برائے خدا ذرا غور کیجئے ۔۔۔ ب ۔ ت ۔ ث
> ج ۔ ح ۔ خ ۔ د ۔ ذ ۔ ر ۔ ز ۔ س ۔ ش ۔ ص ۔ ض ۔ ط ۔ ظ ۔ ع ۔ غ ۔ ف ۔ ق
> ن ۔ ی۔ عربی زبان کے ۲۸ حروفِ تہجی میں سے یہ بائیس حروف ایسے ہیں جن میں امتیاز نقطوں ہی کے ہونے نہ ہونے، یا اوپر نیچے ہونے یا کم و بیش ہونے کی وجہ سے ممکن ہے۔ واضعِ حروف نے جس دن ان حرفوں کو وضع کیا تھا، اگر اسی دن، اسی وقت نقطے بھی ایجاد نہیں کئے تھے اور نقطوں ہی کے ذریعے ان میں امتیاز نہیں رکھا تھا تو اس نے یہ بائیس ہمشکل حروف وضع ہی کیوں کئے تھے ..... اگر نقطوں کا فرق واضع نے نہیں رکھا تھا، تو یقیناً وہ واضع دیوانہ تھا۔ نقط واضع ہی نہیں، پوری کی پوری قوم دیوانی تھی کہ کسی نے تحریر کی اس واضح گمراہ کن خامی کی طرف توجہ نہ کی اور اپنے رسم الخط کی اس بدترین خرابی کو دور کرنے کی ضرورت کسی شخص نے کبھی محسوس نہ کی۔

یعنی انہوں نے یہ کہا تھا کہ آپ ان حروف کو (بلا نقطہ) سامنے رکھئے۔

ٮ ۔ ٮ ۔ ٮ ۔ ح ۔ ح ۔ ح ۔ د ۔ د ۔ ر ۔ ر ۔ س ۔ س ۔ ص ۔ ص ۔ ط ۔ ط ۔
ع ۔ ع ۔

اور بتائیے کہ یہ کیا ہیں؟ جب یہ حروف پہلی بار وضع ہوئے تھے، تو انہیں اس شکل میں وضع کرنے کی ضرورت کیا

تھی، اور اس شکل میں لکھے ہوئے ان حروف کو پڑھ کون سکتا تھا؟ اس کے بعد علامہ تمنا عمادی نے لکھا تھا۔

> خیر زمانہ جاہلیت کی باتیں جانے دیجیے۔ جب وحی آنی شروع ہوئی اور رسول اللہ نے قرآن مجید کی آیتیں اور سورتیں لکھوانا شروع کر دیں تو آپ کو تو اس کا خیال ہوتا کہ بے نقطوں کی تحریر اتنے باہم متشابہ حروف والی رسم خط میں کس طرح صحیح طور سے پڑھی جائے گی۔ کاتبین وحی سے آپ فرماتے کہ نقطے دے دیا کرو۔ اور اگر واضع حروف پاگل تھا اور عہد جاہلیت کے سب لکھے پڑھے دیوانے تھے کہ ایسی گمراہ کن رسم خط کو گلے لگائے ہوئے تھے تو آپ خود نقطے لگانے کی ترکیب بتا دیتے۔ فراست نبویہ، عبدالملک اور حجاج کی عقل سے تو یقیناً بڑھی ہوئی تھی (جن کے متعلق مودودی صاحب نے لکھا تھا کہ انہوں نے سب سے پہلے اس خرابی کو محسوس کیا اور قرآن میں نقطے لگائے۔ (طلوع اسلام)

---(۰)---

اس کے بعد ہم نے فروری ۱۹۶۱ء کے طلوع اسلام میں محترم رحمت اللہ طارق (جو اُس زمانہ میں دار الحدیث مکہ مکرمہ میں قیام پذیر تھے) کا ایک تحقیقاتی مقالہ شائع کیا جس میں انہوں نے ثابت کیا تھا کہ عربی رسم الخط (نقاط کے ساتھ) زمانہ نزول قرآن سے قریب چار سو سال قبل ایجاد ہو چکا تھا اور عہد رسالتمآب میں حروف پر نقاط اور الفاظ پر اعراب وغیرہ (ضوابط تحریر) رائج تھے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں اس زمانہ کے دو مخطوطات کا بھی ذکر کیا تھا جن میں سے ایک ۲۲ھ کی تحریر ہے اور دوسری ۳۱ھ (عہد حضرت عثمانؓ) کی۔

ہم نے اس موضوع کو، اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی کو سامنے لانے کی غرض سے دوبارہ چھیڑا ہے۔ ماہنامہ فکر و نظر (اسلام آباد) کی اپریل ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں فواز احمد طوقان کے مقالہ کا اردو ترجمہ (قسط دوم) شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے — عربی رسم الخط کا آغاز اور ارتقاء — اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ حال ہی میں طائف میں حضرت معاویہؓ کا ایک مخطوط ملا ہے جو ۵۸ھ کا ہے۔

> اس میں ہر اس لفظ پر نقطے موجود ہیں جہاں ان کی ضرورت ہے۔ ث کے تکون بنانے والے تین نقطے عام استعمال کے برعکس، الٹے ہیں۔ ن اور ب کے نقطے حرف کے سروں کے اوپر یا ان کے نیچے لگائے گئے ہیں۔ آخر میں ختم ہونے والی لمبی ب کا نقطہ اس کی افقی لکیر کے نیچے وسط میں لگانے کے بجائے اس کے ابتدائی لٹکتے ہوئے سرے کے نیچے لگایا گیا ہے۔ مثلاً "ب" کے بجائے "ب" ہے۔ اسی طرح ی اور ت کے نقطے ترچھی صورت میں لگائے گئے ہیں۔ مثلاً معوٰیہ کے بجائے معوٰیہ

ہے۔ (اسی طرح) ایک اور دستاویز یا تحریر یا نوشتہ بھی موجود ہے جس پر حرکات کے نشان موجود ہیں۔ یہ ۲۲ھ کا ہے۔ جن حروف پر نقطے موجود ہیں وہ یہ ہیں۔ خ ۔ ذ ۔ ش ۔ ث ۔ ن ۔ لہٰذا ہم بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ عربی خط میں حرکات اور نقطے قدیم زمانہ سے موجود تھے۔

یہ ہیں محققین کی تحقیق کے نتائج اور دوسری طرف ہمارے مودودی صاحب ہیں جن کے متعلق ان کے مریدوں کا پراپیگنڈہ ہے کہ ان جیسا مفکر اور محقق آسمان کی آنکھ نے آج تک نہیں دیکھا ـــــ اور کیا معلوم اس پراپیگنڈہ نے کتنے سادہ لوح مسلمانوں کو گمراہ اور کتنے نوجوانوں کو دین سے برگشتہ کر دیا ہے۔

طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد

۱۔ قرآنِ کریم مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لئے خدا کیطرف سے آخری، مکمل اور محفوظ ضابطۂ ہدایت ہے۔ اسے سب سے پہلے نبی اکرمؐ نے عملاً متشکل کر کے دکھایا۔ اسلئے حضورؐ کی سیرت کے نقوشِ قدم اسلامی زندگی کے لئے نشانِ راہ ہیں۔

۲۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے متعلق جو باتیں ہماری کتب روایات و تاریخ میں آئی ہیں ان میں سے وہی صحیح ہو سکتی ہیں جو قرآن کریم کے خلاف نہ ہوں۔

۳۔ جو حکومت، قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کو ملک میں عملاً نافذ کرے گی، اسے خلافت علیٰ منہاج نبوت یا اسلامی مملکت کہا جائے گا۔

۴۔ اس مملکت کا بنیادی فریضہ یہ ہوگا کہ وہ تمام افراد کی بنیادی ضروریاتِ زندگی ـــــ خوراک، مکان، لباس، علاج وغیرہ ـــــ بہم پہنچائے اور ان کی انسانی صلاحیتوں کے نشوونما پانے کا انتظام کرے۔

۵۔ اسلامی مملکت میں ملوکیت (یعنی خدا کے قوانین کے بجائے انسانوں کے خود ساختہ قوانین کا عمل) تھیاکریسی (یعنی قانون کے معاملہ میں مذہبی پیشواؤں کے حکم کا قولِ فیصل سمجھا جانا) اور سرمایہ داری (یعنی رزق کے سرچشموں پر امت کی بجائے افراد کا قبضہ و اقتدار) نہیں ہوگا۔

۶۔ اسلامی مملکت میں مناصبِ مدارج کا معیار جوہرِ ذاتی اور پختگیٔ سیرت و کردار ہوگا۔

۷۔ طلوعِ اسلام پاکستان میں اسی نظم کے نظام کے قیام کے لئے فکری اور آئینی کوشش کرتا ہے۔ اس کا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے ہے اور نہ ہی کسی مذہبی فرقہ سے، نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ ایجاد کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ فرقہ بندی قرآنِ کریم کی رُو سے شرک ہے۔ امت کے موجودہ فرقے جس طرح نماز، روزہ وغیرہ اسلامی شعائر کے پابند ہیں، یہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کرتا کیونکہ اس سے ملت میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔

۸۔ اگر آپ ان مقاصد سے متفق ہیں تو طلوعِ اسلام کی قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں اسکا ساتھ دیجئے۔ ناظم